پروفیسر محمد منور

بطور اقبال شناس

زبیدہ جبیں

اقبال اکادمی پاکستان

فہرست

دیباچہ	06
باب اول: پروفیسر محمد منور: سوانح اور شخصیت	10
● سوانح	10
● شخصیت	35
باب دوم: اقبال اور فکرِ اقبال سے وابستگی	75
باب سوم: پروفیسر محمد منور کا اقبالیاتی سرمایہ (اردو)	88
● میزانِ اقبال	90
● ایقانِ اقبال	109
● علامہ اقبال کی فارسی غزل	130
● برہانِ اقبال	152
● قرطاسِ اقبال	205
باب چہارم: پروفیسر محمد منور کا اقبالیاتی سرمایہ (انگریزی)	212
باب پنجم: پروفیسر محمد منور کی اقبال شناسی (مجموعی جائزہ)	246
کتابیات:	267
ضمیمے: ۱۔ کوائف نامہ	273
۲۔ تالیفات	283
۳۔ چند دستاویزات	289

انتساب

دادی جان گل بیگم کے نام

جنہیں میری آنکھوں نے کبھی دیکھا تو نہیں لیکن دل نے کبھی بھلایا بھی نہیں، وہ دور ہوتے ہوئے بھی میرے بہت قریب ہیں۔

اور

والدین کے نام

جن کی محبت و شفقت باری تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے، جن کا شکر ادا کرنے سے انسان قاصر ہے۔

☆

اس مقالے پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد نے ۲۰۰۳ء میں مقالہ نگار کو ایم فل (اقبالیات) کی ڈگری عطا کی

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، جس نے قلم کے ذریعے ہمیں لکھنا، پڑھنا اور وہ کچھ سکھایا، جو ہم نہیں جانتے تھے۔ پھر اس نے نفع بخش علم حاصل کرنے کے راستے ہم پر کھولے، اور ہمارے لیے علم کے میدان میں تخصص حاصل کرنے کی راہیں ہموار کیں۔

ایم اے اردو کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا، یہی شوق ایم فل کی جانب راہنمائی کرتا رہا لیکن اردو یا اقبالیات؟ انتخاب ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اقبالیات کی جانب کچھ ''موروثی'' رجحانات اور کچھ ذاتی ذوق وشوق نے دست گیری کی اور ایم فل اقبالیات میں داخلہ لے لیا۔

علامہ اقبال کی شخصیت، نظریات اور شاعری کے جملہ پہلوؤں پر تو ہمارے واجب الاحترام اقبال شناسوں نے بہت کچھ لکھ ڈالا مگر فکرِ اقبال کا ہماری عملی زندگیوں میں گزر نہیں ہو سکا۔ اقبال کے تصورات ہماری روزمرہ زندگی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یہ وہ الجھن تھی جو اقبال کے حوالے سے اکثر و بیشتر ذہن میں کھٹکتی رہتی تھی۔ ''پروفیسر محمد منور بطور اقبال شناس'' کا موضوع والدِ محترم کے مشورے پر منتخب کیا۔ الحمدللہ کہ اس کو منظور کر لیا گیا اور کام بھی شروع کر دیا گیا۔

اس کام کے دوران یہ احساس بڑھتا گیا کہ عظیم اور نظریاتی شخصیات قوم کا قابلِ فخر سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان کے کارناموں کو سمجھنا، قوم کے سامنے انھیں نمایاں کرنا اور خاص طور پر نئی نسل کو ان سے واقف کرانا قومی اور ملی فریضہ ہے۔ یوں یہ مقالہ لکھنا ایک ملّی اور علمی فریضہ ادا کرنے کے مترادف ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے۔

مقالے کا پہلا باب پروفیسر محمد منور کی سوانح اور شخصیت سے متعلق ہے۔ آپ کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا اور آپ کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی کہ اس کے تمام پہلوؤں کو مقالے میں زیر بحث لانا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ ہر پہلو اور ہر واقعہ ہی جاندار' دلچسپ اور بامعنی و بامقصد تھا۔ آپ بہت سے اداروں' انجمنوں اور کالجوں سے وابستہ رہے' ملازمتیں اختیار کیں' تقاریر کیں اور سفر بھی کیے۔ ان سب کا مکمل اور تفصیلی ریکارڈ دستیاب نہیں ہو سکا۔ گو کہ اقبال اکادمی میں ریکارڈ رکھنے کی کوشش ہوتی رہی ہے مگر افسوس کہ آپ کی تقاریر کا پورا ریکارڈ، باوجود کوشش کے مرحوم کے ذاتی کاغذات اور اقبال اکادمی سے بہت کم مل سکا ہے۔ پھر بھی ہم نے مرحوم کے جس قدر سوانحی کوائف و حالات جمع کر دیے ہیں، وہ کہیں اور نہیں ملیں گے۔

دوسرا باب اقبال اور فکرِ اقبال سے پروفیسر محمد منور کی وابستگی سے متعلق ہے۔ پروفیسر محمد منور ایک صاحبِ فکر و نظر اور باکردار شخصیت کے مالک تھے۔ اس باب میں اقبال سے آپ کی وابستگی کے اسباب' پس منظر' پھر ان کے سفرِ اقبالیات کے مختلف مراحل اور مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا اور چوتھا باب ان کی اردو اور انگریزی تصانیف کے تعارف اور جائزے پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مرحوم کو اقبالیات کے فکری اور نظریاتی پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی تھی اور زیادہ تر وہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کے سیاق و سباق میں فکرِ اقبال کی تشریح کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ فکرِ اقبال کے ایک مخلص اور ان تھک مفسر تھے۔

پانچویں باب میں پروفیسر محمد منور کی اقبال شناسی پر مجموعی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس باب سے قارئین کو 'بابائے اقبالیات' کی ہمہ جہت اقبالیاتی جدوجہد اور فروغِ اقبالیات

کے لیے ان کی عملی کاوشوں کا اندازہ ہو سکے گا۔

اس مقالے کی بروقت تکمیل ایک مشکل کام تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور جملہ اہل خانہ کے تعاون سے یہ کام ممکن ہو سکا۔

آخر میں، میں ادارہ نوائے وقت کی خاص طور پر شکر گزار ہوں جنھوں نے نوائے وقت کے پرانے شماروں سے استفادے میں بہت تعاون کیا۔ انھوں نے ۱۹۶۵ء سے مابعد کے شماروں کی بھاری بھرکم غبار آلود فائلیں نکال کر دکھائیں۔ افسوس ہے کہ پنجاب پبلک لائبریری میں اس نوع کے ریکارڈ کی صورت حال انتہائی ناقص ہے۔

اقبال اکادمی کے جملہ شعبہ جات کی ممنون ہوں جنھوں نے متعلقہ ریکارڈ نہایت خوش دلی سے فراہم کیا۔ اکادمی لائقِ تحسین ہے کہ اس نے طلبہ اور تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک ایسا اچھا ماحول فراہم کیا ہے جو جون، جولائی اور اگست کی سخت گرمی اور حبس زدہ موسم میں بھی کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس وقت اقبال اکادمی کا کتب خانہ، بلاشبہ طلبہ و طالبات خصوصاً اقبالیات کے تحقیق کاروں کے لیے ایک شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ سب سے بڑھ کر پروفیسر محمد منور صاحب کی بیٹی محترمہ نزہت صلاح الدین صاحبہ کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہایت خوش اخلاقی سے وقت بھی دیا اور کمال فراخ دلی سے ضروری لوازمے کی بازیافت میں بھی معاونت کی۔

پروفیسر محمد منور کی بلند قامت شخصیت اور ان کے وسیع کام پر مقالہ تیار کرنا ایک مشکل کام تھا۔ یہ احساس مسلسل دامن گیر رہا کہ اس کام کو ویسا ہی بلند پایہ ہونا چاہیے جیسی آپ کی شخصیت تھی۔ تصویر کی خوبصورتی میں تب ہی نکھار آتا ہے جب اس کا فریم بھی مناسب اور دیدہ زیب ہو۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ یہ کاوش محض طالب علمانہ

ہے اور ابھی اس باب میں مزید تحقیق کی ضرورت اور گنجائش موجود ہے۔

دنیا میں انسان کے ہر کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے بعد کسی نہ کسی طرح والدین کی دعاؤں کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ میں اپنے والدین کے لیے دعا گو ہوں: رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِى صَغِيرًا○

خدا تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائیں اور خدا کرے میری یہ تحقیقی تربیت (research training) علمِ نافع کے طور پر آیندہ کے لیے مفید ثابت ہو۔ آمین

زبیدہ جبیں

۵۔اپریل ۲۰۰۳ء

باب نمبر ا

سوانح اور شخصیت

سوانح

بھیرہ، کوہستانِ نمک (صوبہ پنجاب) کے دامن میں واقع، دریائے جہلم کے کنارے آباد ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ ماضی میں بعض حملہ آوروں (مثلاً: امیر تیمور، شیر شاہ سوری) کے حملوں میں تباہی کا شکار ہوا، لیکن یہ نمک کی ایک بڑی منڈی تھی اور یہاں، برعظیم ہند کے مختلف علاقوں سے قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی، اس لیے بھیرہ برباد ہو کر بھی آباد ہوتا رہا۔ا

مرزا ہاشم الدین (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۵ء) اسی قصبے کے باسی تھے۔ ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء کو ان کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا، جس کا نام محمد منور رکھا گیا۔۲ مرزا ہاشم الدین پیشے کے اعتبار سے مدرس تھے۔ بعد ازاں ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ محمد منور کی والدہ محترمہ کرم بی بی (وفات: ۱۹۸۵ء) روایتی وضع کی گھریلو خاتون تھیں۔۳

ننھے منور گیارہ ماہ کے تھے تو مرزا ہاشم الدین بھیرہ سے سرگودھا منتقل ہو گئے۔ ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز سرگودھا ہی میں ہوا۔ سکول کی رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر کی ادبی فضا نے بھی آپ کی ذہنی نشوونما اور فکری پرداخت میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ چار پانچ سال کے تھے، تو عام طور پر صبح کے وقت والدہ یا کوئی اور رشتہ دار خاتون یوسف زلیخا یا کونج و چھوڑا یا معراج نامہ وغیرہ پڑھا کرتی تھیں۔ ایک ذہین بچے کے لیے ایسے قصے کہانیوں سے اثرات قبول کرنا فطری امر ہے۔

آپ کے والد مرزا ہاشم الدین، علامہ محمد اقبال کے بڑے مداح تھے۔ ان کے ایک دوست عبدالرحمٰن، مرزا غالب کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ دونوں دوستوں کے

درمیان اقبال اور غالب کی شاعرانہ عظمت کی بابت گفتگو رہا کرتی تھی۔ بعض اوقات کچھ دوستوں کی فرمائش پر مرزا ہاشم الدین یوسف زلیخا کا قصہ ایک عمدہ لَے کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔[4]

محمد منور ابتدائی جماعتوں میں کوئی غیر معمولی طالب علم نہ تھے' بلکہ پڑھائی میں ان کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔ کبھی کبھار سکول چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ انھیں شعر و شاعری سے زیادہ رغبت تھی۔ تیسری جماعت میں تھے تو پنجابی میں شعر کہنے کی کوشش کی' اس کی ایک وجہ تو گھر کا ماحول تھا' دوسرے (جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے) کونج و چھوڑا سنتے رہتے تھے۔ چنانچہ رنج والم اور جدائی کی کیفیات سے ان کے ذہن نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔[5]

چھٹی جماعت میں باقاعدگی سے شعر کہنے لگے۔ ابتدائی زمانے میں وہ حفیظ جالندھری سے متاثر ہوئے۔ شاہنامہ اسلام کی نقل میں شعر کہتے کہتے پورا ایک رجسٹر تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے کلام سے بھی دلچسپی بڑھنے لگی۔ انھیں اقبال کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ رفتہ رفتہ حافظ' سعدی اور فردوسی کے اشعار بھی بغیر کسی شعوری کاوش کے یاد ہونا شروع ہو گئے۔ ابھی میٹرک میں تھے تو دیوانِ حافظ ذوق وشوق سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا کی جماعت نہم میں زیر تعلیم تھے تو ایک استاد محمد عالم قمر صاحب نے امتحان میں طلبا کو مضمون لکھنے کے لیے جو چار عنوانات دیے' ان میں سے ایک عنوان تھا: ''تیری غفلت سے چمن وقفِ خزاں ہوتا ہے اب''۔ محمد منور نے امتحانی پرچہ تو جلدی سے حل کر دیا اور جو وقت بچا' اس میں (شاید اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے) دو صفحوں کی ایک نظم لکھ کر ممتحن کو پیش کر دی۔[6]

یوں ہائی سکول کے زمانے ہی سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ماسٹر محمد

عالم قمر صاحب مضمون لکھنے کے لیے موضوع دیا کرتے' ہونہار مضمون نگار بہ سہولت اور بہ صد ذوق و شوق' مضمون لکھ کر انھیں پیش کر دیتے۔ یہ اتنے اچھے معیار کے مضامین تھے کہ امتحان کے بعد ماسٹر صاحب نے ان سے' مذکورہ مضامین کی نقول مانگیں اور کہا کہ تمھارے بعد آنے والے طالب علموں کو ہم یہ مضامین دکھا کر بتائیں گے کہ یہاں ایک طالب علم محمد منور اس معیار کے مضامین لکھتا رہا ہے۔ ۷

سکول کے زمانے میں وہ طلبا کی انجمن کے ہفتہ وار اجلاس منعقد کرانے کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔ محمد منور اس کے سیکرٹری تھے۔ اس کے شرکا میں محمد علی شاہ حاذق' رشید احمد اصغر' اظہر الدین احمد ظہور وغیرہ شامل تھے۔ ۸ ان جلسوں میں مضمون پڑھے جاتے اور تقریریں بھی ہوتیں۔ محمد منور تحریر و تقریر دونوں میں اپنے جوہر دکھاتے۔ یہ آپ کی تقریری سرگرمیوں کی ابتدا تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

[ایک بار] "صحت دولت سے بہتر ہے" پر بولنے کے لیے مجھے حکم دیا گیا' جو کچھ میں بول سکا' بولا اور حتی الوسع یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ واقعی' صحت دولت سے بہتر ہے۔" ۹

گھر کا ماحول دینی تھا اور گھر سے باہر معاشرے میں عمومی ماحول ویسی دینداری کا نہیں تھا۔ سرگودھا شہر میں بڑی تعداد میں سکھ اور ہندو بھی رہتے تھے۔ مسلم گھرانوں میں دینی روایات کے تحفظ کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بچوں کے لیے اذان' مسجد اور سپارہ اہم علامتیں تھیں۔ چنانچہ اس ماحول میں شعر و شاعری میں بھی دینی اور اسلامی رجحان کا اظہار ایک قدرتی بات تھی۔ ۱۰ بہر حال لڑکپن میں نظم و نثر دونوں کی مشق جاری رہی' البتہ شاعری میں غزل کی بہ نسبت نظم زیادہ کہا کرتے تھے۔

۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا کے طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان (رول نمبر ۲۰۸۸۹ کے تحت) پنجاب یونی ورسٹی سے پاس کیا۔ ۱۱

اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ ایک طرف تو گھر کے حالات ایسے تھے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ گھریلو ذمہ داریوں میں شریک ہو کر ان کے لیے سہولت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کا جی چاہتا تھا کہ مزید تعلیم حاصل کروں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اس بنا پر تھا کہ انھیں ''پروفیسر'' بننے کا شوق تھا۔ یہ شوق کیسے پیدا ہوا؟ ایک انٹرویو میں وہ بتاتے ہیں:

نویں جماعت کے زمانے میں ایک مباحثے میں شریک ہوا۔ وہاں کے پرنسپل ملک احمد حسین صاحب تھے۔ وہاں جب میں نے پروفیسروں کا رکھ رکھاؤ دیکھا تو بڑا متاثر ہوا...... ان لوگوں کا انداز' اٹھنا بیٹھنا' مجھے اب تک یاد ہے' ان کا گاؤن پہننا' کالج کا خاموش سا پروقار ماحول' یہ سب چیزیں مجھے بہت پسند آئیں اور ان لوگوں کو دیکھ کر ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پروفیسر ہی بنوں گا۔۱۲

ممکن تھا کہ اپنے شوق کو دبا کر گھریلو ذمہ داریوں میں شریک ہو جاتے لیکن اتفاق سے ان کے ایک واقف کار نے بتایا کہ میں علی گڑھ یونی ورسٹی انتظامیہ کا رکن ہوں۔ وہاں عربی والوں کو وظیفہ بھی ملتا ہے۔ اس واقف کار نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ میں آپ کو کچھ سہولتیں دلوانے کی کوشش کروں گا۔ محمد منور نے سوچا کہ اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ علی گڑھ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ سفر کی تیاری شروع ہوئی۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے مطابق لباس تیار کروایا گیا۔ روانگی کے روز اسٹیشن پہنچے' وہ واقف کار بزرگوار بھی موجود تھے اور دہلی جا رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ اثنائے گفتگو ان صاحب نے کوئی ایسی بات کہی جس سے محمد منور کی اَنا کو ٹھیس لگی اور وہ علی گڑھ جانے کا ارادہ ترک کر کے وقتِ روانگی سے دس منٹ پہلے ریل گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ بتاتے ہیں:

مجھے یہ محسوس ہوا کہ ابھی تو ان کا احسان مجھ پر شروع بھی نہیں ہوا' اور ان کے لب و

لہجے میں فرق آ گیا ہے اور ان کی گفتگو کا انداز بدل گیا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص جو فی الحال میرا محسن بھی نہیں ہے' ابھی سے خود کو میرا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چنانچہ میں نے صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے علی گڑھ جانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ ۱۳

محمد منور گاڑی سے اتر آئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر بننے کا شوق فی الحال بالائے طاق رکھا کہ شاید قدرت کو ابھی یہ منظور نہیں تھا۔ گھر کے حالات کا تقاضا تھا اور چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی' لہٰذا انھوں نے فوری طور پر ملازمت کرنے کی ٹھانی۔ ریلوے میں کمرشل کلرک کے طور پر ملازم ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ساڑھے اٹھارہ برس تھی۔ پہلے پیشہ ورانہ تربیت کے لیے کچھ عرصہ والٹن ٹریننگ سنٹر لاہور میں رہے، اس کے بعد اڑھائی سال تک مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر بطور کمرشل کلرک کام کرتے رہے۔

۱۹۴۴ء کے آخر میں ریلوے کی ملازمت ترک کر کے محکمہ انہار میں آ گئے۔ پہلا تقرر کرانہ ڈویژن سرگودھا کے ایک سیکشن روڈیاں والا میں ہوا۔

یہ زمانہ ان کے لیے ایک طرح کی آزمائش کا تھا۔ محکمہ انہار میں کام کی نوعیت کے پیشِ نظر' آپ بہت محتاط رہتے کہ کوئی غلط کام نہ کیا جائے اور اپنے فرائض دیانت داری اور ذمہ داری سے ادا کیے جائیں۔ کچھ لوگ ناجائز کام کروانے کے لیے کچھ رقوم انھیں دینے کی کوشش کرتے' مگر ناکام رہتے۔ ۱۴ محمد منوّر کوشش کرتے کہ کام درست اور قاعدے قانون کے مطابق کیے جائیں۔ ۱۵

۱۹۴۴ء ہی میں آپ کی شادی ہو گئی۔ آپ کی اہلیہ آپ کی ماموں زاد تھیں۔ ۱۶ ملازمت کی مصروفیات اور عائلی ذمہ داریوں کے باوجود' مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق برابر دامن گیر رہا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے' انھیں پروفیسر بننے کا شوق تھا۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے ''پروفیسری'' کے سوا کوئی شے پسند نہ تھی۔ یہ خیال ان کے ذہن

میں برابر پرورش پاتا رہا کہ جب بھی موقع ملا' میں ایم۔اے کر کے پروفیسری اختیار کروں گا۔۱۷

چنانچہ ملازمت کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کی کاوش بھی کرتے رہے۔باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کسی کالج میں داخل ہو کر پڑھنے کے لیے تو حالات سازگار نہ تھے' لیکن محمد منور نے ذاتی طور پر مطالعہ جاری رکھا۔

۱۹۴۵ء میں فارسی آنرز کا امتحان درجہ سوم میں پاس کیا (رول نمبر ۱۶۳۶) اور ۱۹۴۷ء میں بی اے کا امتحان (رجسٹریشن ۹۶۸۳۔۲۔۴۵' رول نمبر ۱۲۳۶۱) پنجاب یونی ورسٹی سے پاس کیا۔۱۸

لیکن انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ پرائیویٹ تعلیم میں مشکلات درپیش ہیں اور اس طرح اساتذہ سے براہِ راست حصولِ علم کا موقع بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں ملازمت سے ایک سال کی رخصت لی' اور پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ یہاں انھیں متعدد قابل اور نامور اساتذہ کرام سے تحصیلِ علم کا موقع ملا۔

اساتذہ کی صحبت نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کیا اور انھیں جلا بخشی۔ان کا شمار یہاں کے چند گنے چنے باذوق طلبہ میں ہونے لگا۔اساتذہ کرام ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ابواللیث صدیقی اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے آپ کو علاحدہ تعلیمی سرٹیفکیٹ عطا کیے' جن میں محمد منور کی جملہ قابلیتوں کا اعتراف کیا گیا تھا۔یہ سب اساتذہ ان کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔شعر و ادب کا ذوق تو تھا ہی' مطالعہ بھی کرتے رہتے تھے' اب اساتذہ کی صحبت و تربیت نے ان کے اندر سخن فہمی کے ذوق کو اور بھی پختہ کر دیا۔۱۹

اورینٹل کالج کے اساتذہ کے نزدیک یہ بات قابلِ ستائش تھی کہ محمد منور تحصیل علم کی

خاطر ملازمت سے رخصت لے کر آئے تھے اور ملازمت کی پابندیوں اور مصروفیتوں کے باوجود ان کا حصولِ علم کا شوق متاثر نہیں ہوا۔۲۰ اس ابتدائی زمانے میں بھی ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زبان وادب کے مسائل سے آگاہ ہیں۔ اساتذہ نے ان کے تنقیدی مضامین میں سنجیدگی اور توازن کا اعتراف کیا۔۲۱

ڈاکٹر سید عبداللہ نے آپ کی قابلیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا:

میں بڑے اعتماد و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کو فیاضِ ازلی کی طرف سے بہت سی خوبیاں عطا ہوئی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ ان کے صحیح ادبی مذاق نے متاثر کیا۔ فارسی اور اردو میں غیر معمولی لیاقت کے علاوہ عربی زبان اور ادب سے بھی ان کو واقفیت حاصل ہے، جس کی وجہ سے ان کی نظر وسیع اور ذوق تربیت یافتہ ہو گیا ہے..... ان میں صحیح طالب علمانہ ذوق اور شوق اور سچی علمی سپرٹ پائی جاتی ہے۔
۲۲

مرزا محمد منور نے ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج کے طالب علم کی حیثیت سے ایم اے اردو کا امتحان (رول نمبر ۲۶۳)، درجہ دوم میں پاس کیا۔ ایک سال بعد پنجاب یونی ورسٹی کے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ایم اے عربی کا امتحان (رول نمبر ۵۴۶) پاس کیا۔۲۳

اب محمد منور صاحب کو ''پروفیسر'' کی منزل قریب محسوس ہو رہی تھی۔ بطور استاد آپ کا پہلا تقرر دیال سنگھ کالج، لاہور میں ہوا۔ مگر یہ ایک سال کے لیے عارضی اسامی تھی۔ کالج کے پرنسپل اور معروف ادیب، شاعر اور نقاد سید عابد علی عابد صاحب، محمد منور کی صلاحیتوں سے واقف تھے، اس لیے وہ ان کی آمد کے منتظر تھے۔۲۴ مگر محمد منور کا ذہن اس عارضی اسامی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ غالباً اس لیے کہ انھوں نے کئی دوسرے اداروں میں بھی درخواست بھیج رکھی تھی اور انھیں کہیں نہ کہیں مستقل تقرر کی

امید تھی۔ چنانچہ جلد ہی انھیں ۱۹۵۳ء میں اسلامیہ کالج گجرانوالہ میں لیکچرر اردو منتخب کیا گیا۔ عین انھی دنوں میں جناح اسلامیہ کالج، سیالکوٹ میں لیکچرر عربی میں تعیناتی کا حکم نامہ بھی آ گیا۔ اب ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کس ملازمت کو ترجیح دی جائے۔ اسی اثنا میں ایک تیسری صورت پیدا ہوئی۔ ۲۰ / اکتوبر ۱۹۵۳ء کو گورنمنٹ کالج لائل پور میں بطور اردو لیکچرران کا تقرر ہو گیا۔۲۵ یہ سرکاری ملازمت تھی اور اس زمانے میں اسے بہت بہتر سمجھا جاتا تھا چنانچہ محمد منور نے لائل پور جا کر ''پروفیسری'' کا منصب سنبھال لیا۔ یوں علی گڑھ جانے والی گاڑی سے اتر جانے کے بعد، دس سال کی محنت نے انھیں اپنے اصل ''اسٹیشن'' تک پہنچا دیا۔

لائل پور (حال: فیصل آباد) میں بطور لیکچرر اردو آپ نے درس و تدریس کی ذمہ داری بڑی محنت و مہارت اور دیانت داری سے انجام دی۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

ہم نے کوشش کی کہ اپنے منصب کی توہین نہ ہونے دیں۔ ہفتہ بھر میں بتیس پیریڈ لینا ہوتے تھے۔ جس کلاس کو لینا ہوتا تھا، وہ نہیں ملتی تھی۔ کیوں کہ ان دنوں تین چوتھائی طلبہ درختوں کے نیچے یا کھلے میدانوں میں بیٹھا کرتے تھے۔۲۶

پروفیسر محمد منور علم و ادب کا طبعی ذوق رکھتے تھے۔ ایم اے اردو اور عربی کرنے کے بعد مطالعہ بھی خاصا وسیع ہو گیا۔ علامہ اقبال کے کلام کو بھی تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا چنانچہ علامہ اقبال سے ان کی ذہنی وابستگی اب ایک طرح کی محبت، بلکہ عقیدت میں بدل چکی تھی۔ آپ نے اپنے ہم خیال اور چند قریبی احباب اور دوستوں کے ساتھ مل کر لائل پور میں ''مجلس اقبال'' قائم کی۔ دوستوں نے آپ ہی کو اس کا پہلا صدر مقرر کیا۔۲۷ اس مجلس کے تحت وقتاً فوقتاً علمی و ادبی نشستیں منعقد ہوتیں۔ اس کے ساتھ عموماً ہر سال ۲۱ / اپریل کو بڑے پیمانے پر یومِ اقبال منایا جاتا تھا اور کسی معروف شخصیت کو اجلاس میں مدعو کیا جاتا۔ اسی ضمن میں مختلف مواقع پر راجا حسن

اختر، جسٹس کیانی اور آغا شورش کاشمیری نے مجلس کے جلسوں سے خطاب کیا۔اس مجلس کے روحِ رواں آپ ہی تھے۔۲۸

لائل پور میں تدریسی مصروفیات اور مجلس اقبال کے تحت جلسوں کے انتظام و اہتمام کے ساتھ ساتھ، آپ کی قلمی اور تحریری سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔لائل پور کے آٹھ سالہ قیام کے دوران میں، آپ نے بہت کچھ لکھا اور مختلف کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ طٰہٰ حسین کی دو کتابوں، الفتنہ الکبریٰ اور ادیب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔نیز نظام الملک طوسی کی سیاست نامہ (فارسی) کو بھی اردو میں منتقل کیا۔

رفتہ رفتہ آپ کی شہرت لائل پور سے باہر دوسرے شہروں تک پہنچنے لگی۔لاہور میں ہر سال ۲۱راپریل کو مرکزیہ مجلس اقبال کے تحت یومِ اقبال کی ایک بڑی تقریب منعقد ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں مرکزیہ نے آپ کو یومِ اقبال پر تقریر کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء میں مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسے سے خطاب کیا۔۲۹ راجا حسن اختر آپ کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔۱۹۶۱ء میں ان کے ایما پر آپ کو مرکزیہ مجلس اقبال کا رکن بنالیا گیا۔۳۰ مرزا منور کے لیے یہ ایک طرح کا اعزاز تھا۔

اسی سال ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا۔ یہاں آپ بطور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوئے۔لائل پور کے مقابلے میں لاہور، ایک بڑا علمی و ادبی مرکز تھا۔ پروفیسر محمد منور جیسے ذہین اور قابل شخص کے لیے یہاں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے وسیع مواقع موجود تھے۔آپ نے ان مواقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ایک طرف تو آپ نے تحریری اور تصنیفی کام جاری رکھا۔ ابوحنیفہ الدینوری کی کتاب الاخبار الطّوال کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔حسین نصر کی انگریزی کتاب Three Muslim Sages کا اردو ترجمہ ۱۹۶۹ء میں چھپا

۔

پنجاب یونی ورسٹی سے جون ۱۹۶۷ء میں منعقدہ ایم اے فلسفے کا امتحان ۷۰۰ میں سے ۴۴۳ نمبر لے کر پاس کیا۔

لاہور میں آپ کو بہت سے اہلِ علم اور معروف شخصیات سے میل جول، گفتگوؤں اور استفادے کا موقع بھی ملا۔ ان ملاقاتوں اور صحبتوں نے آپ کی صلاحیتوں کو اور جلا بخشی۔ مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسوں میں تقریروں کے ساتھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۷۲ء میں اقبال پر مضامین کا پہلا مجموعہ میزانِ اقبال، یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور نے شائع کیا۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے مرحوم دوست راجا حسن اختر کے نام کیا۔۳۱

۱۹۷۷ء کو حکومتی سطح پر 'سالِ اقبال' قرار دیا گیا۔ تقریبات کے لیے وفاقی حکومت نے 'نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ ولادتِ علامہ اقبال' قائم کی۔ پروفیسر منور صاحب کو بھی اس کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کا دور تھا۔ مرزا محمد منور، پیپلز پارٹی اور بھٹو کے شدید مخالف تھے اور برملا ان پر تنقید بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ایک اقبال شناس اور سکالر کے طور پر آپ کی ایسی شہرت تھی اور اتنا وقیع مقام تھا کہ آپ کو نیشنل کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ سالِ اقبال ہی میں آپ کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایقانِ اقبال اور علامہ اقبال کی فارسی غزل۔

دسمبر ۱۹۷۷ء میں پہلی عالمی اقبال کانگریس، لاہور میں منعقد ہوئی، جس میں بطور مندوب اور مقالہ نگار آپ بھی شریک ہوئے اور اپنا مقالہ پڑھا۔

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی نے آپ کو شعبۂ اقبالیات کے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی۔۳۲ مگر شاید آپ کو لاہور چھوڑنا پسند نہ تھا، اس لیے آپ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اور بدستور گورنمنٹ کالج، لاہور میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۷۷ء میں پہلی عالمی اقبال کانگریس کے موقع پر جنرل ضیاء الحق نے پنجاب یونی ورسٹی میں اقبال چیئر قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور یونی ورسٹی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس منصب کو سنبھالیں۔ مرزا صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی اور وہ ۳۰ ر اپریل ۱۹۸۰ء کو گورنمنٹ کالج سے یونی ورسٹی میں آ گئے۔ ۳۳ شعبۂ اقبالیات' اورینٹل کالج کی عمارت میں قائم کیا گیا، لہٰذا یہیں آپ کی نشست ہوتی تھی۔ آپ کے احباب اور دوستوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس زمانے میں آپ نے اقبال کانگریس (۱۹۷۷ء) کے منتخب مقالات کے تین مجموعے (اردو۔ انگریزی۔ عربی) مرتب کر کے شائع کیے۔ (ان کا تعارف ضمیمہ۲ میں دیکھیے)

۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء کو آپ باضابطہ طور پر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ان دنوں ڈاکٹر وحید قریشی اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ہو کر اسلام آباد چلے گئے تو محمد منور کو ان کی جگہ اقبال اکادمی میں بطور ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ۳۴ آپ نے اس ذمہ داری کو جز وقتی ڈائریکٹر کے طور پر قبول کیا اور ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک آپ بیک وقت پنجاب یونی ورسٹی اور اقبال اکادمی لاہور میں کام کرتے رہے۔

اسی زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی کے زیر اہتمام دوسری عالمی اقبال کانگریس (نومبر ۱۹۸۳ء) منعقد ہوئی، جس میں پروفیسر صاحب نے Iqbal on Man`s Self- Ivasion کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔

اقبال اکادمی کی مجلسِ حاکمہ کے فیصلے کے مطابق آپ کو ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء ہی سے آیندہ تین سال کے لیے ۲۱ ویں گریڈ میں اقبال اکادمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ۳۵ آپ نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء کو اس عہدے کا چارج لیا۔ ۳۶ مگر وزارتِ تعلیم نے باقاعدہ تقرر نامہ جاری نہ کیا۔ اعتراض یہ تھا کہ منور صاحب ۲۰ ویں گریڈ میں ریٹائر

ہوئے ہیں ۔اس سے اگلے سکیل (۲۱) میں تقرر کے لیے صدرِ پاکستان سے اجازت درکار ہے ۔کئی ماہ تک تقرر نامہ وزارت تعلیم نے جاری نہ کیا۔۳۷ انھیں ایک سال ایک ماہ تک تنخواہ بھی نہ ملی۔

اسی اثنا میں مجلسِ حاکمہ کے ۲۲ویں اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ پروفیسر محمد منور صاحب کو قومی پے سکیل کا ۲۱واں گریڈ مع چھے اضافی ترقیوں کے دیا جائے ۔ان کو اس کی تمام متعلقہ قانونی مراعات بھی حاصل ہوں گی ۔چونکہ گذشتہ ایک سال اور چند ماہ کی مراعات ان کو اب نہیں دی جاسکتیں، لہٰذا ان کی مدتِ معاہدہ یکم اگست ۱۹۸۶ء ہی سے شمار ہوگی اور فیصلے کا اطلاق آیندہ تین سال یعنی ۳۱ جولائی ۱۹۸۹ء تک ہوگا۔واضح کیا گیا کہ یہ مشاہرہ ناظم صاحب کے عہدے کے لیے نہیں ہے بلکہ پروفیسر صاحب کی غیر معمولی علمیت' استعداد اور اقبالیاتی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے لیے مقرر کیا جارہا ہے۔۳۸

اس کے بعد انھیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے سرکاری تقرر نامہ ملا۔۳۹

اندرونِ ملک اقبالی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ بیرون ملک بھی اقبال کی شخصیت اور فکر کو متعارف کرانے کے لیے کوشاں رہے ۔۲۳ نومبر ۱۹۸۵ء کو آپ نے مصر کا دورہ کیا۔اس دورے میں ڈاکٹر جاوید اقبال اور جناب پیر کرم شاہ بھی موجود تھے ۔یہاں آپ نے مختلف یونی ورسٹیوں میں تقاریر کیں ۔قاہرہ یونی ورسٹی کے جلسۂ یومِ اقبال میں بھی خطاب کیا۔۴۰

۱۹۸۶ء میں حیدر آباد دکن بھارت کے عالمی اقبال سیمینار میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا ۔لیکن وہ اس میں شرکت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے ۔ان کا خیال تھا کہ بھارتی حکومت ہماری تقریروں سے من مانے مطالب نکال کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے گی اور اسے پراپیگنڈے کا ذریعہ بنائے گی ۔اس سیمینار میں

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب بھی مدعو تھے۔ مرزا صاحب کے مشورے پر جاوید صاحب نے بھی بھارت جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب، اقبال اکادمی کے نمایندے کے طور پر اس سیمینار میں شریک ہوئے۔۴۱

۱۹۸۶ء میں آپ نے ہفتۂ اقبال کے سلسلے میں شام کا سفر کیا اور کئی تقریبات سے خطاب کیا۔ ایک تقریب میں آپ نے کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات کے حوالے سے ۲۵ منٹ تک عربی میں گفتگو کی۔۴۲ دسمبر ۱۹۸۶ء میں انھوں نے ابوظہبی، دبئی اور ایران کا دورہ کیا۔ اس دورے میں دبئی ٹیلی ویژن نے ان کا ایک انٹرویو بھی نشر کیا اور آپ نے مختلف یونی ورسٹیوں میں منعقدہ اقبال تقریبات میں بھی شرکت کی۔

آپ نے ۳۱ اگست ۱۹۸۶ء سے اقبال اکادمی کی لائف ممبر شپ اختیار کی۔۴۳
۱۹۸۸ء میں آپ ناروے، بلجیم اور ہالینڈ کے دورے پر گئے۔ یہ سب دورے اقبال سے متعلق کانفرنسوں، سیمی ناروں یا تقاریب میں شرکت کے حوالے سے کیے گئے۔ نیوزی لینڈ کے دورے کی رپورٹ وہاں کے پاکستانی سفارت خانے نے ۹ اگست ۱۹۸۸ء کو بھیجی، جس میں پروفیسر محمد منور کی کارکردگی کو سراہا گیا۔۴۴ اسی طرح ۱۹۸۹ء میں آپ نے بنگلہ دیش کا دورہ بھی کیا۔

۱۹۸۸ء میں اقبال سے وابستگی کے حوالے سے آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ مرکزیہ مجلس اقبال غالباً برِّعظیم کی سب سے قدیم اقبال سوسائٹی ہے۔ اپنے نام اور مقاصد کے حوالے سے یہ اقبال کے پیغام اور فکر کو روشناس کرانے کے لیے سالہا سال سے جلسے منعقد کرتی چلی آرہی ہے۔ پروفیسر محمد منور اس کے مرکزی مقررین میں سے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ نے پہلی بار اس کے جلسے میں تقریر کی اور ۱۹۸۷ء

تک متواتر یہ سلسلہ جاری رہا۔ کسی ایک آدمی نے اتنا طویل عرصہ مرکزیہ کے سٹیج سے خطاب نہیں کیا۔۴۵

نومبر ۱۹۸۷ء کے جلسے میں جسٹس جاوید اقبال نے جنرل ضیاء الحق کے خلاف تقریر کر ڈالی۔ پروفیسر محمد منور، ضیاء الحق کے مداح تھے۔ انھیں اس پر صدمہ ہوا۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۸۸ء میں مرکزیہ کے صدر مجید نظامی صاحب نے یومِ اقبال کی تقریب کے مہمان خصوصی کے طور پر عبدالستار خاں نیازی کے ساتھ مولانا کوثر نیازی کو بھی بطور مقرر دعوت دے ڈالی۔ مرزا صاحب نے اسے پسند نہیں کیا۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ کسی ایسے جلسے میں شرکت نہیں کروں گا، جس میں پیپلز پارٹی کا کوئی عہدیدار یا وزیر شریک ہو۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آیندہ مرکزیہ کے جلسے میں تقریر نہیں کریں گے۔ مرکزیہ کے جلسے کے دعوتی کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری اقبال اکادمی کے ناظم کی حیثیت سے آپ کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے کارڈ تو چھپوا دیے مگر مقررین میں اپنا نام شامل نہیں کیا۔ ۲۷ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ اپریل ۱۹۸۸ء کے جلسے میں آپ نے تقریر نہیں کی۔ تاہم بطور سامع شریک رہے۔ لیکن اس کے بعد شریک ہونا بھی چھوڑ دیا۔ آپ کے بقول:

دوست تو شرکت کے لیے کہتے رہے، مگر دل نہیں مانا۔ جب مرکزیہ ایک نظریاتی فورم نہ رہا تو پھر اس میں کیا دل کشی اور دلچسپی ہو سکتی ہے۔۴۶

مرکزیہ سے آپ کی وابستگی اور پھر قطع تعلق کی تفصیل پوشیدہ تری خاک میں... میں دیکھی جا سکتی ہے۔۴۷ بہر حال اس وقت آپ کی کیفیت اپنے اس شعر کے مصداق تھی:

منور، کارواں کی رہ جدا ہے راہ سے اپنی
سفر تنہا مگر خوئے حدی خوانی نہیں جاتی ۴۸

۱۹۸۹ء میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ ۲۵؍ دسمبر کو یوم قائداعظم کے موقع پر آپ نے تقریر کی۔ بے نظیر بھٹو کو بطور وزیرِاعظم عنانِ حکومت سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر محمد منور نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

میرا تو بڑا پاکستان تھا' جو آدھا رہ گیا ہے' بلکہ آدھے سے بھی کم ہو گیا ہے' یہ کس نے توڑا؟ بھٹو نے توڑا۔ جس طرح بھٹو حکومت کا ایک دن گزرتا تھا' تو میں سمجھتا تھا کہ پاکستان کی عمر میں سے سو سال کم ہو گئے ہیں' اسی طرح بھٹو کی بیٹی آجانے کے بعد میرا احساس بالکل وہی ہے۔۴۹

ان کے اپنے بقول یہ سب باتیں کہہ کر میں نے خود ''اعلان جنگ'' کر دیا تھا۔۵۰ انھی دنوں آپ مراکش کے دورے پر جانے والے تھے۔ روانگی سے قبل ۲؍اپریل ۱۹۸۹ء کو وزارتِ تعلیم' حکومت پاکستان کی طرف سے آپ کو ایک نوٹس ملا۔ اس میں کہا گیا تھا:

Now therefore, you, Prof.Muhammad Munawwar, are given 3 months' notice for termination of your services and accordingly you will stand relieved on 2nd July 1989.۵۱

(لہٰذا اب، آپ مرزا محمد منور کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ آپ کو ۳ ماہ بعد ملازمت سے برخواست کر دیا جائے گا۔ اور اس کے مطابق آپ ۲؍جولائی ۱۹۸۹ء کو ملازمت سے سبک دوش ہو جائیں گے۔)

آپ کا تقرر بطور ڈائریکٹر ۳۱ جولائی ۱۹۸۹ء تک ہوا تھا۔ اب اس کو ۲ جولائی ۸۹ء تک محدود کر دینے کی کوئی ظاہری وجہ پیش نہیں کی گئی تھی۔ آپ نے یہ اطلاع پا کر کسی بے صبری' یا ناگواری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ کے خیال میں نظریے کی خاطر عہدے

کی قربانی دے دینا کوئی بڑی بات نہیں۔

مجلس حاکمہ نے اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے ۱۴ مئی ۱۹۸۹ء کو اقبال اکادمی کے دفتر واقع نیو مسلم ٹاؤن، لاہور میں ایک اجلاس بلایا۔ مجلس حاکمہ کا خیال تھا کہ مرزا محمد منور کو ملنے والا حالیہ نوٹس خلافِ قاعدہ ہے کیوں کہ ڈائریکٹر کے تقرر اور معزولی کا اختیار مجلس حاکمہ کو ہے نہ کہ وزارتِ تعلیم کو۔ اس (۵۷ویں) اجلاس کے متعلقہ حصے (آئٹم 1) کی کارروائی وزارتِ تعلیم کو بھجوائی گئی۔ ۵۲ جواباً وزارتِ تعلیم نے لکھا:

The notice has been issued with the apporval of the competent authority۵۳

(یہ نوٹس بااختیار افسر کی منظوری کے بعد جاری کیا گیا۔)

اس پر مجلس حاکمہ نے کہا کہ یہ کوئی ٹھوس موقف نہیں ہے، ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن ''ایوانِ بالا'' میں کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور یکم جولائی ۱۹۸۹ء کو مسٹر احمد فراز اپنا تقرر نامہ لے کر اقبال اکادمی پہنچ گئے۔ ۵۴۔ ۲ جولائی ۱۹۸۹ء کو اقبال اکادمی کے ناظم کا چارج چھوڑنے سے پہلے پروفیسر صاحب نے یہ تحریر لکھ کر دفتر چھوڑ دیا:

مجلسِ حاکمہ کی جانب سے اپنے عہدے کا چارج چھوڑنے کا کوئی حکم نامہ موصول نہیں ہوا۔ جو میری مدتِ میعاد یعنی ۳۱/ جولائی سے قبل عہدے کی ذمہ داری سپرد کرنے کے لیے ضروری ہے اور اقبال اکادمی آرڈیننس ۲۶ مجریہ ۱۹۶۲ء شق نمبر ۲۰ (۱) کا قانونی تقاضا ہے۔ لیکن چونکہ احمد فراز صاحب چیئرمین اکادمی ادبیات، مجھ سے نظامت اکادمی کے عہدے کا چارج لینے تشریف لائے ہیں اور میں کسی ناگوار صورتِ حال یا پیچیدگی کو جنم نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا آج مورخہ ۲/ جولائی کو بعد دوپہر ۱:۳۰ بجے اپنا دفتر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ۵۵

آپ کی اس جبری اور غیر قانونی ریٹائر منٹ کے خلاف روزنامہ مشرق نے اداریہ لکھا‘ جس میں پروفیسر محمد منور کی علمیت اور اقبالیات کے شعبے میں آپ کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا گیا‘ اور اس کے ساتھ ہی ان کی جبری اور خلاف قانون سبک دوشی پر تنقید کی گئی تھی۔۵۶

احمد فراز کا تقرر عارضی طور پر تھا۔ اس کے بعد شہرت بخاری کو مستقل طور پر اقبال اکادمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔

اس عرصے میں پروفیسر محمد منور صاحب نے اپنا علمی و ادبی و تحریری کام جاری رکھا۔ متعدد مرتبہ ’ہمدرد‘ کے جلسوں میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کو زیرِ تجویز خواتین یونی ورسٹی کے کمیشن کا چیئر مین مقرر کیا گیا‘ مگر آپ نے معذرت کرتے ہوئے اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ محمد نواز شریف کو ایک خط میں لکھا:

میں نے اقبال اکیڈیمی سے سبک دوش ہونے کے بعد اپنے منتشر اوراق دیکھے تو احساس ہوا کہ کئی کتب کا مواد برباد ہو رہا ہے۔ فرصتِ حیات کتنی باقی ہے‘ معلوم نہیں۔ دل نے مشورہ دیا ہے اور میں نے مشورہ قبول کر لیا ہے‘ کہ اب اور کوئی منصب سرکاری یا نیم سرکاری نہ سنبھالوں تاکہ وہ اوراقِ پریشاں جن پر سالہا سال کی محنت مرقوم ہے مرتب کر سکوں‘ لہٰذا میں معذرت خواہ ہوں۔۵۷

ایک سکالر اور ماہر اقبالیات کی حیثیت سے آپ نہ صرف ملک گیر شہرت رکھتے تھے‘ بلکہ بیرونِ ملک بھی آپ کی شخصیت کی ایک پہچان تھی اس لیے آپ کو وقتاً فوقتاً بیرونِ ملک سے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ ایسی ہی ایک دعوت پر آپ نے مارچ ۱۹۹۰ء میں ٹورانٹو کا سفر کیا اور وہاں ۲۳/ مارچ کو منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کی۔ پھر بفیلو (امریکہ) میں ’’اقبال اور تحریکِ پاکستان‘‘ کے موضوع پر ایک جلسے میں اظہار کیا۔ اس زمانے میں آپ کی تقریری سرگرمیاں

جاری رہیں۔آپ نے مضامین لکھے اور احباب اور عزیزوں کی فرمائشوں پر مختلف کتب پر فلیپ یا دیباچے بھی تحریر کیے۔شعروشاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پنجاب یونی ورسٹی سنڈیکیٹ کے اجلاس منعقدہ ۵/اگست ۱۹۹۰ء کے مطابق پروفیسر محمد منور کو دوبارہ علامہ اقبال چیئر کی پیش کش کی گئی' مگر آپ نے معذرت کر لی۔

اقبال اکادمی کی مجلس حاکمہ نے اپنے اجلاس (منعقدہ اسلام آباد' مورخہ ۹/مئی ۱۹۹۱ء) میں فیصلہ کیا کہ شہرت بخاری کو اکادمی کی نظامت کے عہدے سے فوری طور پر فارغ کر دیا جائے۔نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ پروفیسر محمد منور کو تین سال کے لیے ناظم مقرر کیا جائے۔۵۸ اس فیصلے کے مطابق پروفیسر صاحب اپنے سابقہ ۲۱ویں سکیل پر انھی شرائط ملازمت کے تحت دوبارہ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔آپ نے ۱۳/مئی ۱۹۹۱ء سے آیندہ تین سال کے لیے ناظم اقبال اکادمی کا عہدہ سنبھال لیا۔

۵۹

دسمبر ۱۹۹۱ء میں آپ قرطبہ کی بین الاقوامی اقبال کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔اکادمی کے نائب ناظم محمد سہیل عمر اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔۶۰ قرطبہ کانفرنس میں آپ نے علامہ اقبال پر انگریزی میں ایک مقالہ بعنوان Iqbal, A Motivator of Purposefull Life (اقبال' بامقصد زندگی کے علمبردار) بھی پیش کیا اور ایک سیشن کی صدارت بھی کی۔

۶۱

۱۹۹۲ء میں قطر' عمان اور ابوظہبی کے سفر پر گئے۔آپ کا یہ سفر تحریک پاکستان کے حوالے سے منعقدہ تقریبات میں شرکت کے لیے تھا۔

یہاں ایک اہم واقعے کا ذکر ضروری ہے' جس سے پروفیسر محمد منور کے ایثار اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔اقبال اکادمی جب مالی خسارے کا شکار ہوئی تو انھوں نے ایک

لاکھ پچیس ہزار روپے کی خطیر رقم اقبال اکادمی کو بطور عطیہ دے دی۔ مزید برآں تنخواہ لینا بھی چھوڑ دی۔ اس سلسلے میں ان کا خط ملاحظہ ہو:

I, Professor Muhammad Munawwar, hereby donate a sum of Rs.1,25,000/- to Iqbal Academy for its publications. The programme especially for those books / journals which are in the waiting list for the last one year or so and could not be published due to shortage of funds.

2. I also hereby voluntarily surrender my basic pay in BPS-21 plus six advance increments accepting an amount of Rs.5,441/- per month consisting of the allowances only...."۶۲

(۱۔ میں پروفیسر محمد منور، ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کی رقم اقبال اکادمی کو، اس کی اشاعتِ کتب کے لیے ہدیتاً پیش کرتا ہوں۔ یہ (رقم) بالخصوص اُن کتابوں/رسالوں کے لیے ہے، جو گذشتہ ایک سال یا زائد عرصے سے رقوم کی کمی کی وجہ سے اشاعت کے منتظر ہیں۔)

(۲۔ میں رضاکارانہ طور پر اپنی بنیادی تنخواہ بی پی ایس ۲۱ سے، مع چھے اضافی ترقیوں کے، اقبال اکادمی کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ اب میں صرف ۵۴۴۱ روپے ماہانہ الاؤنس وصول کیا کروں گا۔)

مگر مجلس حاکمہ نے اس اعانت کو قرضِ حسنہ قرار دیا اور واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔۶۳

آپ نے مجلس حاکمہ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔۶۴

اس سلسلے میں آپ نے اکادمی کے نئے ڈائریکٹر ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک خط میں لکھا:

میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ مجلس حاکمہ نے میری اس مالی اعانت کو قرضِ حسنہ قرار دیا ہے اور مذکورہ رقم اب واپس کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا اگر اکادمی کی عزتِ نفس کا تقاضا ہے کہ مذکورہ تمام رقم مجھے واپس کر دی جائے تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں، سرِ تسلیم خم ہے۔ (اس خط کی نقل اقبال اکادمی سے دستیاب ہوئی)۔

۱۹۹۳ء میں آپ ۷۰ کے پیٹے میں تھے۔ ضیق النفس اور شیاٹیکا کے امراض میں تو کئی سال سے مبتلا تھے، اب ذیابیطس کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ اِدھر اقبال اکادمی کے بارے میں بھی آپ متفکر رہتے تھے، کیوں کہ اقبال اکادمی کو سالانہ گرانٹ مل جاتی تھی لیکن ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کے بعد اتنی رقم نہیں بچتی تھی کہ اکادمی کے اشاعتی پروگرام کو چلایا جا سکے۔ آپ کے ذہن میں تو یہ منصوبہ تھا کہ اقبال اکادمی کو وسعت دے کر پورا ایک سیکریٹریٹ بنا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتوں کی تبدیلی بھی صورتِ احوال پر اثر انداز ہوتی تھی۔ آپ نے خرابیِ صحت اور ناسازگار حالات کے پیشِ نظر ۱۶/ مارچ ۱۹۹۳ء سے ۱۵/ مئی ۱۹۹۳ء تک کی رخصت لی۔ پھر اس رخصت میں مزید ایک ماہ کے لیے توسیع کروائی۔ رخصت کے اس زمانے میں آپ کی توجہ شعر گوئی کی طرف مبذول رہی۔ اور آپ نے قومی اور ملی موضوعات پر حالاتِ حاضرہ سے متعلق متعدد نظمیں لکھیں۔۶۵

کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد، آپ نے یکم اگست ۱۹۹۳ء سے ۳۱/ اگست ۱۹۹۳ء تک مزید رخصت لی اور ساتھ ہی اکادمی کو مطلع کیا کہ وہ مزید کام نہیں کر سکتے۔ اس پر مجلس حاکمہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال (نائب صدر، اقبال اکادمی) نے ان سے اس صورت حال پر فون پر بھی بات کی۔ پروفیسر محمد منور نے کہا

کہ وہ ان حالات میں کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور استعفا دینا چاہتے ہیں۔ ۶۶ ساتھ ہی جاوید اقبال صاحب کے نام ایک خط میں استعفا کی وجوہات بیان کیں ۔آپ نے لکھا:

مئی ۱۹۹۱ء سے اقبال اکادمی کے عہدۂ نظامت کی ذمہ داری بارِ دگر میرے سپرد کی گئی ۔اپنے پیرو مرشد کے نام سے منسوب اس ادارے کی سربراہی میرے لیے باعثِ مسرت و افتخار تھی ۔سو میں نے قبول کی، نیت یہ تھی کہ ادارہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی سیکریٹریٹ بن جائے..... لیکن روزِ اوّل سے یہ مسئلہ میرے لیے باعثِ تشویش رہا کہ اکادمی کے مالی وسائل بمشکل اتنے تھے جن سے عملے کی تنخواہ اور دیگر انتظامی اخراجات پورے ہوسکتے تھے..... اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں نے مجلس حاکمہ کو بھی بارہا متوجہ کیا کہ کہیں سے فنڈ کا اہتمام کیجیے، ورنہ اکادمی کو قفل لگایئے تا کہ اس عذاب سے نجات پاسکوں لیکن اس کے حل کے لیے کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔ ۶۷

یاد رہے کہ اس صورت حال کے پیشِ نظر آپ نے اپنی تنخواہ اکادمی کو دینا شروع کردی تھی اور خود سے حصولِ فنڈ کی کوششیں بھی کیں مگر صورتِ حال جوں کی توں رہی ۔اس خط میں مزید لکھتے ہیں:

اس اڑھائی سال کے اس اعصاب شکن عمل نے میری صحت کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ میں اس دباؤ کے تحت ذیابیطس کا شکار ہوگیا ہوں ۔دمے کی تکلیف میں جو پہلے سے تھی' روز بروز اضافہ ہو رہا ہے' اندریں حالات میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ عہدۂ نظامت کی ذمہ داری مزید سنبھالے رکھ سکوں ۔لہٰذا اگر مالی احوال جیسے کہ ہیں' تو میرا استعفا بہ حسرت و یاس ۔۶۸

اقبال اکادمی سے سبک دوشی کے بعد بھی آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا۔

اخبارات میں خصوصاً نوائے وقت میں یومِ پاکستان، یومِ اقبال اور یومِ قائداعظم جیسے مواقع پر ان کا ایک نہ ایک مضمون ضرور شائع ہوتا تھا۔ اپنے مضامین آپ نے کتابی صورت میں مرتب کیے۔ ۱۹۹۸ء میں ایک مجموعہ پاکستان: حصارِ اسلام کے نام سے اور دوسرا قرطاسِ اقبال کے عنوان سے شائع ہوا۔

۱۹۹۷ء میں انگریزی کتاب Dimensions of Iqbal پر آپ کو قومی صدارتی ایوارڈ (برائے ۱۹۸۵۔۱۹۸۷ء) دیا گیا۔۶۹

۱۹۹۷ء ہی میں حکومت پاکستان کی طرف سے آپ کو 'ستارۂ امتیاز' کا اعزاز دیا گیا۔ اس کا اعلان ۱۴راگست ۱۹۹۷ء کو کیا گیا۔۷۰ اور ۲۳ر مارچ ۱۹۹۸ء کو صدرِ پاکستان نے آپ کو یہ اعزاز عطا کیا۔ اس موقع پر ملنے والی سند پر یہ عبارت درج ہے:

ادب (مطالعہ اسلامیات) کے شعبے میں آپ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان نے پروفیسر محمد منور کو 'ستارۂ امتیاز' کا اعزاز عطا کیا ۔۷۱

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۹۲ء میں آپ کی خدمات علمی کے اعتراف میں حکیم محمد سعید کی طرف سے آپ کو 'وثیقۂ اعتراف' دیا گیا تھا۔ یہ ایک شیلڈ تھی۔۷۲

زندگی کے اس دور میں پروفیسر محمد منور کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ عمر بھر وہ کام کے عادی رہے تھے مگر اب کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہو چکی تھی۔ طرح طرح کے عوارض لاحق تھے۔ دمہ اور شوگر خاص طور پر پریشان کن تھے۔ پھر بھی کبھی کبھار مضامین یا نظمیں وغیرہ لکھتے رہتے تھے اور کبھی مختلف تقاریب میں بھی چلے جاتے۔ گھر پر دوست احباب سے مجلسی نشستیں بھرپور طریقے سے جاری رہتیں۔ اس زمانے میں آپ گلشن راوی والے مکان میں آ گئے تھے۔ ان کے قریبی احباب اور بعض عزیز زیادہ تر اتوار کو ان کے ہاں آ جاتے اور ماضی و حال کی سیاست پر

خوب خوب تبصرے ہوتے' شعر و شاعری اور ادب کی باتیں ہوتیں۔ پروفیسر صاحب پھلوں اور چائے سے حاضرین مجلس کی تواضع کرتے۔

۱۹۹۹ء میں آپ کی صحت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی آرام کرنا پڑتا' بلکہ اس سال آپ کا بیشتر وقت ہسپتالوں میں گزرا۔ آپ کے لیے ہسپتال جانا کوئی خوش گوار عمل نہ ہوتا تھا لیکن جب ہسپتال میں ہوتے' آپ کے احباب ہر اتوار کو ہسپتال میں آ کر محفل جماتے۔ مرزا صاحب نے کبھی بھی اپنی تکلیف کا ذکر نہیں کیا' بلکہ حتی الوسع ہمت کے مطابق گفتگو میں حصہ لیتے۔ بیماری کی حالت میں بہت صبر کرتے۔ چڑ چڑا پن یا جھنجلاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ طرح طرح کے امراض لاحق تھے۔ ان کی بیٹی اکثر کہا کرتیں: ابا جی، آپ اتنا کھانا نہیں کھاتے جتنی دوائیاں کھاتے ہیں۔ تو وہ جواب میں مایوسی کی بجائے اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ہمیں علاج کی سہولتیں تو میسر ہیں۔ ۴۳ے

۱۹۹۹ء کے سال کا بیشتر حصہ اتفاق ہسپتال' لاہور میں زیر علاج رہے۔ ان کی بیماریوں کے بارے میں ۱۴ جولائی ۱۹۹۹ء کی ایک رپورٹ اس طرح ہے:

He suffers from complicated unstable insulin dependent diabetes mellitis hypertension ischamic heart disease, recurrent LVfailure (weak cardiac pump.). He also has bronchial asthma with chest infection, gastric and wound over lt. leg _ Nature of most of his medical illness demand prolonged medical therapy and regular follow-ups.۴۴ے

پروفیسر محمد منور کو اوائل عمر ہی سے کام اور محنت کی عادت تھی‘ مگر اب بیماری میں کچھ نہ کر سکتے تھے، بس سوچتے رہتے ۔ مسلمانوں کے مستقبل کی فکر دامن گیر رہتی ۔ اخبارات کے ذریعے حالاتِ حاضرہ سے واقف رہنے کی کوشش کرتے ۔ وفات سے چار یا پانچ ماہ قبل اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بچوں سے پوچھ لیتے تھے کہ آج کی کیا خبر ہے؟ ۷۵ آپ کی بیٹی بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ بستر پر بے کار پڑے ہیں ۔ پہلے پہل تو بیماری کے دوران بھی لکھنے پڑھنے کا کام کر لیا کرتے تھے‘ مگر اب ایسا ممکن نہ تھا اور جب کوئی کام نہ کر سکتے تو اس احساس کے تحت اور پریشان ہوتے کہ میں اب کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ انھوں نے گذشتہ دو سالوں سے لکھا بھی کچھ نہیں تھا۔ ۷۶

ہسپتال میں مختلف سہولیات میسر تھیں اور بر وقت اور فوری طبی امداد بھی مل جاتی تھی ۔ پھر بھی عید کے قریب کچھ دنوں کے لیے آپ کے اہلِ خانہ آپ کو گھر لے آئے ۔ پروفیسر صاحب خود نہیں چاہتے تھے کہ گھر جائیں‘ کیونکہ طبیعت خراب ہونے پر گھر میں زیادہ تکلیف محسوس کرتے ۔ گھر میں فوری طبی امداد بھی نہیں ملتی تھی ۔ بہر حال لواحقین انھیں گھر لے آئے ۔ گھر آ کر کچھ روز بعد طبیعت نسبتاً بہتر ہوگئی ۔ ۷۷

ذیابیطس کی وجہ سے کمزور اور نحیف و نزار ہو گئے تھے ۔ چلنے پھرنے سے بالکل قاصر ہو چکے تھے ۔ ان کے منہ بولے بیٹے سید یوسف عرفان ان کی شیو بناتے اور ٹوتھ برش بھی کرواتے ۔ ۷۸ ان کے داماد صلاح الدین اور نواسے بھی ہر طرح سے آپ کی دیکھ بھال کرتے ۔ اور اس خدمت کرنے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔ ۷۹ آپ کے بہت قریبی دوست پروفیسر محمد سلیم کہتے ہیں: وفات سے قبل آخری اتوار کو جب ہم مرزا صاحب کے ہاں جمع ہوئے تو انھوں نے اپنے احباب سے کہہ دیا کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ ۸۰

اور ایسا ہی ہوا۔ ۷ فروری ۲۰۰۰ء کو آپ کے گھر والوں نے سوچا کہ اب انھیں ہسپتال لے جائیں ۔ ملازم بابا اور رنگ زیب سے کہا گیا کہ وہ آپ کے کپڑے تبدیل کروادیں ۔ پروفیسر محمد منور کی بیٹی بیان کرتی ہیں کہ ملازم بابا نے گھنٹی بجا کر مجھے بھی نیچے ابا جان کے کمرے میں بلالیا ۔ امی نے مجھے دیکھ کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگیں: مجھے لگتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں ۔ میں نے ابا جان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ بہت گرم تھا' میں نے اپنا بازو ان کے سر کے نیچے رکھ لیا ۔ ان کی رنگت دیکھ کر مجھے بھی پریشانی ہوئی ۔ اس اثنا میں ڈاکٹر کو بلایا گیا' جنھوں نے چیک کر کے ہمیں بتایا کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے ۔ میں نے ان کی آنکھیں بند کر دیں ۔ ابا جان آرام سے ہمیں چھوڑ گئے ۔ ۸۱ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

یہ ۷ر فروری دن دس بجے کا وقت تھا ۔ نمازِ جنازہ عشا کے بعد' مون مارکیٹ گلشن راوی لاہور کی قریبی گراؤنڈ میں پڑھی گئی' جس میں لاہور اور بیرونِ لاہور سے آنے والے' کثیر تعداد میں ان کے احباب' شاگرد اور عقیدت مند' نیز ادیب و شاعر شریک ہوئے ۔

پروفیسر محمد منور کی وفات کو علمی اور ادبی حلقوں میں اور قومی سطح پر شدت سے محسوس کیا گیا ۔ روز نامہ نوائے وقت نے لکھا: ''پروفیسر مرزا محمد منور'' بھی علم و ادب کی بساط سے اٹھ گئے ۔ درس و تدریس، تحقیق، تنقید، شاعری اور اقبال شناسی کا ایک عہد زریں ختم ہو گیا ۔'' ۸۲

نامور علمی اور ادبی شخصیتوں نے ان کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ۸۳

m ان کے انتقال سے اردو تنقید اور تحقیق کو بڑا نقصان پہنچا ہے ۔ (احمد ندیم قاسمی)

m ہم ایک روشن دماغ اور وسیع الخیال شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں ۔ (عبدالعزیز

خالد)

mمرزا صاحب کی وفات پاکستان، عالم اسلام، اقبالیات اور اردو ادب کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

mمرزا محمد منور کی وفات سے ہمارے قومی افق سے ایک سچا پاکستانی، قائداعظم اور اقبال کا مخلص ترین شیدائی اور محب وطن و دانش ور رخصت ہوگیا ہے۔(ڈاکٹر انور سدید)

معروف شاعر پروفیسر جعفر بلوچ نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اس طرح کیا:

علم و دانش کا فسردہ ہے جہاں تیرے بعد
غم کی تصویر ہے ہر ایک سماں تیرے بعد
اڑ گیا بعد ترے رنگِ رخِ بزمِ سخن
بجھ گئی روشنیِ حرف و بیاں تیرے بعد
ماند سی پڑ گئی گل چہرگیِ دین و وطن
محو سے ہوگئے منزل کے نشاں تیرے بعد
باوجود اس غم و اندوہ کے ان شاء اللہ
ہم رہیں گے ترے رستے پہ رواں تیرے بعد

شخصیت

شخصیت کسی انسان کے طور طریقوں' رویوں اور مجموعی طرزِ عمل کا نام ہے۔ کسی انسان کی شخصیت کس درجے یا مقام و مرتبے کی ہے یا کس نوع کی ہے؟ اس کے تعین میں انسان کے گفتار و کردار' اس کے معمولات' شب و روز' عادات و اطوار' رویوں اور رجحانات وغیرہ کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔

انسان کا ظاہر اس کے باطن اور ذہن وقلب کی غمازی کرتا ہے' جو کہ انسان کے اندر ہو۔اس کا اظہار' اس کی گفتگو اور اس کے اعمال وافعال سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کے بقول پروفیسر محمد منور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔۸۴ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں۔وہ محض ایک ''شخص'' نہ تھے' بلکہ اپنی ذات میں انجمن تھے اور پوری ایک علمی و ادبی تحریک تھے۔ان کی شخصیت میں وہی خوبیاں تھیں' جو ان کے مرشدِ معنوی حضرت علامہ اقبال کا خاصہ تھیں' یعنی خلوص و گداز' وضع داری' درویشی اور ایک طرح کی دردمندی ودل سوزی۔''۸۵

مرزا محمد منور چہرے مہرے اور وضع قطع سے بہت سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ایک سنجیدہ اور باوقار انسان' جو شخص ان کے قریب جاتا' خواہ بالکل اجنبی ہی کیوں نہ ہو'اسے منور صاحب سے تعارف حاصل کر کے باتیں کرتے ہوئے ایک اپنائیت کا احساس ہوتا تھا اور وہ ایک سادہ مزاج اور پر خلوص انسان نظر آتے تھے۔ان کی سادگی اور سنجیدگی ان کے باطنی خلوص' درد مندی اور دل سوزی سے عبارت تھی۔جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں یا ان کی مجالس میں حاضر ہوئے ہیں یا ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ:

☆اسلام ☆پاکستان ☆علامہ اقبال ☆قائداعظم ☆ملتِ اسلامیہ

ان کے لیے محض پانچ الفاظ نہ تھے بلکہ یہ ان کے لیے دنیا کی سب سے عزیز اور محبوب ترین متاع کی حیثیت رکھتے تھے۔یہ مرزا محمد منور کی محبت اور عقیدت کا مرکز ومحور تھے۔اسلام ان کا دین اور ایمان تھا۔وہ ساری عمر اقبال اور قائد کو خراج عقیدت پیش کرتے رہے اور ان کی تحریری اور تقریری

سرگرمیاں پاکستان اور امت مسلمہ کی بہتری اور سربلندی کے لیے وقف رہیں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی' کبھی پیچ و تابِ رازی ۸۶

جناب نعیم صدیقی انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں جہاں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ احیائے اسلام اور عروج ملت کے لیے پروفیسر محمد منور مرزا کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ایک جذبۂ بے تاب شروع سے نورِ آفریں اور حرارت انگیز رہا ہے۔ وہاں اس معروف دانش ور اقبالیات کے بارے میں یہ بات بھی بڑی مسرت اور پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدانخواستہ کسی وقت اگر ساری قوم مفاد پرستی' اور منافقت کی رو میں بہ جائے تو لازماً ایک شخص قائداعظم کے جامع تصورِ پاکستان اور دو قومی نظریے (ہندو قوم الگ' مسلم قوم الگ) کا سچا نقیب اور ہندو قوم کے تعصبات اور اوہام و خرافات اور دیوار برہمن کے طلسم کو توڑنے والا یہ جانباز سپاہی میدانِ تاریخ میں موجود رہے گا۔ ۸۷

آپ نے اپنی ۷۷ سالہ زندگی میں نہایت گراں قدر کارنامے انجام دیے۔ وسیع مطالعہ' برجستہ اور موثر تقاریر' بھرپور مجلسی زندگی' بے شمار دوست احباب سے خوش گوار تعلقات' انتظامی اور تدریسی مصروفیات' تحریری مشاغل' خدمتِ خلق (طلبہ اور مستحقین کی اعانت) اور اسی طرح کے بہت سے کام آپ نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ آپ محض حجرہ نشین عالم نہ تھے' بلکہ آپ نے حسبِ توفیق اپنے کسبی اور وہبی علم کو نوجوانوں تک پہنچانے کے لیے بھی مقدور بھر کوششیں کیں۔ تدریسی زندگی کے طویل عرصے میں انھوں نے با صلاحیت نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے خیالات سے

متاثر کیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سراج منیر اور سہیل عمر جیسے بہت سے اصحاب نے مرزا صاحب سے گہرا اثر قبول کیا۔ اسلام اور فکرِ اقبال کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے اور قائد و اقبال کا دفاع کرنے کے لیے مرزا صاحب کو جب بھی اور جہاں کہیں بھی جانا پڑا، آپ نے دریغ نہیں کیا۔ بالخصوص ہماری مسلح افواج کے پرعزم اور باہمت نوجوانوں کے اندر نظریۂ پاکستان راسخ کرنے کے لیے آپ نے درجنوں لیکچر دیے، اور ان میں ہزاروں کتابیں اور پمفلٹ تقسیم کیے۔۸۸

کیا ایسے کارنامے کا ہر شخص اہل ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ یہ تو صرف ایسے لوگوں کا نصیب ہو سکتا ہے، جو اپنے مقاصدِ حیات کا تعین کر چکے ہوں اور صرف متعین کر کے نہ رہ جائیں، بلکہ عملاً اس کے حصول کے لیے سعی و کاوش بھی کریں۔ پروفیسر صاحب کی پوری شخصیت میں، مقاصدِ زندگی کے لیے جدوجہد کا ایک تسلسل موجود ہے۔ پروفیسر محمد منور کے داماد جناب صلاح الدین ایوبی، کی یہ رائے بڑی صائب ہے:

پروفیسر محمد منور جب بہ یک وقت دوقومی نظریے کے نقیب، حضرت قائداعظم کے ترجمان اور علامہ اقبال کے سفیر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں، تو درحقیقت وہ توحید کے داعی اور علمبردار رہیں۔ پروفیسر صاحب نے رات کی تنہائیوں میں اپنے ربِ واحد سے جو تعلق خاطر قائم کیے رکھا، اس کی بدولت ان کی ذات میں موجود ..... نقطہ نورے کہ نام او خودی است.... اس نقطۂ نور کی پرورش ہوتی رہی۔۸۹

ایوبی صاحب آگے چل کر پروفیسر محمد منور کی شخصیت کی اس مضبوطی، استحکام اور غیر متزلزل ایمان و ایقان کی بنیاد ان کی سحر خیزی کو قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے یہ فضیلت ایک روز میں حاصل نہیں کی۔ مجھے اس بات

کا پورے وثوق کے ساتھ علم ہے کہ ان کے یہ علمی مراتب ان کی سحر خیزیوں کی برکات ہیں۔۹۰

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' مرزا محمد منور کی زندگی اسلام' پاکستان' اقبال' قائداعظم اور ملت اسلامیہ سے عبارت تھی۔ اسلام کا نفاذ اور دین اسلام کی سر بلندی ان کی دلی آرزو تھی۔ پاکستان اس لیے ان کو محبوب تھا کہ یہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا اور اب حصارِ اسلام اور اسلام کا قلعہ ہے۔۹۱ اقبال ان کے دلوں کی دھڑکن تھا، کیوں کہ وہ اسلام کا شارح، علمبردار اور تصورِ پاکستان کا خالق تھا۔ قائداعظم سے انھیں اس لیے عقیدت تھی کہ انھوں نے اقبال کے تصورِ پاکستان میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ امت مسلمہ کے لیے ان کا دل دردو سوز سے معمور تھا۔ کیوں کہ ملت کی سر بلندی ہر مسلمان کے ایمان کا عقیدہ اور مقصدِ زندگی ہے۔

آپ کا قلبِ مصفّٰی ہمیشہ اسلام اور پاکستان کی نظری و عملی حفاظت کے لیے مضطرب رہا۔ اقبال سے آپ کی محبت بھی انھی دو بنیادوں کی وجہ سے گہری اور پایدار تھی۔ پاکستان کی نظریاتی اساس کی حفاظت کے بارے میں آپ بہت حساس تھے۔ وہ ہر لحاظ سے پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم دیکھنا چاہتے تھے۔ بقول میرزا ادیب: ''مرزا صاحب سچے اور پکے پاکستانی'' تھے۔۹۲ وہ پاکستان کی سیاسی' معاشرتی اور ملی وقومی الجھنوں کا بڑا گہرا احساس رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سے ان مسائل کا حل پیش کرتے رہتے تھے۔ آپ کو حقیقتاً پاکستان سے عشق تھا اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت فکرمند رہا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان اسلامیانِ ہند کے تحفظ کے لیے وجود میں آیا ہے اور یہ اسلام کا قلعہ ثابت ہوگا۔ آپ نے اس مقصد کو اپنے لیے زندگی کا مشن بنالیا تھا کہ ہر طریقے سے پاکستان کو مضبوط کرنا ہے' اسی وجہ سے آخری عمر میں جب شدتِ بیماری کی وجہ سے

کچھ نہ کر سکتے تھے تو بڑے بے چین ہو جاتے۔ آپ کی بیٹی نزہت صلاح الدین بیان کرتی ہیں:

آخری وقت تک ان کی خواہش تھی کہ مکمل حالات سے باخبر رہیں۔ چار یا پانچ ماہ سے تو انھوں نے اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا لیکن بچوں سے پوچھتے رہتے تھے کہ آج کی خبر کیا ہے؟ ۹۳

ڈاکٹر وحید عشرت روایت کرتے ہیں کہ محمد خان جونیجو کی وزارتِ عظمٰی کے دوران مرزا صاحب نے ایک جلسے میں حکومتِ پاکستان کی افغانستان پالیسی پر کڑی تنقید کی۔ آپ نے کہا:

جونیجو صاحب! آپ وزیر اعظم ہیں' آپ کی بطور وزیر اعظم کچھ مجبوریاں ہوں گی' میں ایک درویش منش انسان ہوں میری کوئی مجبوری نہیں' افغانستان کے معاملے پر ہم کسی کمپرومائز کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ۹۴

پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے پیچھے اصل محرک اور اساس اسلام سے محبت تھی۔ تحریک پاکستان کے علاوہ تاریخ اسلام کے بارے میں آپ کا وسیع مطالعہ تھا۔ مسلمان مورخین' محققین اور علما کے کارناموں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سپین کے سفر کے دوران آپ کی گفتگوؤں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ اس دور کے سلاطین اور امرا کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں پر ہمیشہ رنج وغم کا اظہار کرتے تھے۔ ۹۵

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی ۱۹۵۳ء سے آخر تک آپ کی مجالس سے فیض یاب ہوتے رہے اور متعدد اہم مواقع پر انھیں آپ کا قرب حاصل رہا۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ ہائیڈل برگ اور کیمبرج کی اقبال چیئر کا انٹرویو تھا۔ انٹرویو لینے والے صاحب ایک ایسی پارٹی سے متعلق تھے جو پاکستان مخالف نظریات میں بڑی واضح تھی۔ ہم چاہتے

تھے کہ پروفیسر صاحب اس چیئر کے لیے منتخب ہو جائیں تو اقبال کو عالمی سطح پر روشناس کرانے میں بڑی مدد ملے گی۔ جس پر میں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ کانگریسی باپ کے کانگرسی بیٹے کو انٹرویو دینے جا رہے ہیں۔ مصلحتاً اپنی tone ذرا سی down رکھیے گا۔ آپ نے فوراً ہمیں دوٹوک الفاظ میں کہا کہ یہ چیئر آنی جانی چیز ہے، اس کے لیے اپنے نظریات سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ مجھے پہلا موقع ملا ہے کہ میں قائد کی عظمت اس کے منکر کے ہاں پیش کروں۔ لہٰذا میں تمھاری تجویز قبول نہیں کر سکتا۔

آپ انٹرویو کے ۴۵ منٹ کے وقت میں ۳۰ منٹ تک قائداعظم کے فضائل بیان کرتے رہے اور نتیجے کی کوئی پروا نہیں کی۔ ۹۶

نظریۂ پاکستان پر انھوں نے اچھی خاصی تحقیق کے بعد اس کے سیاسی، تہذیبی اور فکری عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ مرزا صاحب کا خیال تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں اور پاکستان کے وجود کو صدق دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ وہ پاکستان کے وجود کو اللہ کی رضا تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ اس کا حامی و ناصر ہے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جو نقصان پہنچائے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ وہ اس سلسلے میں اندرا گاندھی، مجیب الرحمان اور ذوالفقار علی بھٹو کی مثال دیا کرتے تھے کہ پاکستان دشمنی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ پیپلز پارٹی ایک تو انھیں بھٹو کے نظریات کی وجہ سے ناپسند تھی، دوسرے سقوطِ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار بھی وہ بھٹو ہی کو قرار دیتے تھے اور ان کی پاکستان دشمنی کا برسرِ عام اور مجالس میں بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ بشیر حسین برلاس بتاتے ہیں:

ایک سیاسی جماعت کے نظریات سے ان کو سخت اختلاف تھا۔ جب وہ پارٹی برسر اقتدار تھی اور مرزا صاحب خود گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے تو سٹیج پر ایسی تقریریں

کرنے لگے جو حکومت کو پسند نہ آئیں۔ میں نے عرض کیا کہ جناب‘ آپ سرکاری ملازم ہیں‘ اپنی جان کے دشمن کیوں بن رہے ہیں تو کہنے لگے: یہ پاکستان کا معاملہ ہے تم چاہتے ہو کہ میں اپنی نوکری بچانے کے لیے ملک پر کلہاڑا چلتا دیکھتا رہوں اور خاموش رہوں۔ نوکری سے نکال دیں گے تو ریڑھی لگا کر گنڈیریاں بیچ لوں گا۔۹۷

آپ کی بیٹی کہتی ہیں کہ بھٹو کے ساتھ ان کا اختلاف آخری دم تک برقرار تھا۔ انھوں نے بھٹو کی یہ خطا کبھی معاف نہیں کی کہ اس نے میرے وطن کے دو حصے کر دیے۔ وہ کہتے تھے کہ سارے سسٹم میں اگر ایک بھی شخص خراب ہو تو وہ تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ مثال دیا کرتے تھے کہ لکڑیوں کا ٹال کافی محنت سے لکڑیاں جمع کر کے بنایا جاتا ہے لیکن اگر اس کو جلا کر راکھ کرنا ہو تو ایک دیا سلائی کافی ہے۔۹۸

پروفیسر محمد منور نے تاریخ و تحریک پاکستان اور دو قومی نظریے کی توضیح و تشریح میں بہت کچھ لکھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی مرزا صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> پروفیسر محمد منور بزرگ نسل کے گناہوں کے کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ تحریک پاکستان کے سیاسی اور قانونی عوامل پر تو اکثر باتیں کی جاتی ہیں۔ لیکن نئی نسل کو پاکستان کی روح سے روشناس کرنے کا فریضہ ادا کرنے میں اکثر کوتاہی ہوتی رہی ہے۔ مرزا صاحب اسی کوتاہی کی تلافی میں مصروف ہیں
>
> ۹۹۔

پاکستان‘ اقبال اور قائداعظم سے ان کی محبت ایک جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایمان و یقین کا سودا بن چکی تھی۔ آپ کے برادرِ خورد پروفیسر محمد مظفر مرزا بیان کرتے ہیں

> کہ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مجھے فرمایا کہ اگر تم قومی اور ملی کام کرتے رہو گے تو خدا تعالیٰ تمھاری عمر بڑھا دے گا۔ اسی طرح آپ فرمایا کرتے

تھے کہ اگر آپ ان تینوں ہستیوں کے ساتھ دل و جان اور خلوص نیت سے محبت و احترام کرتے رہیں گے تو خدا تعالیٰ آپ لوگوں کو دنیا میں عزت و احترام سے نوازے گا۔ اگر تینوں کے ساتھ بغض، عناد اور نفرت رکھیں گے تو ذلیل و خوار ہوں گے۔۱۰۰

اپنے مقصد سے مرزا صاحب کی لگن اور اس کے لیے جدوجہد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پاکستان میں مصریوں کا 'عرب کلچر سنٹر' ایک مختصر مدت (۷ سال) کے لیے قائم رہا۔ مگر یہ سنٹر مخصوص سیاسی اور منفی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بالخصوص یہاں بھارتی مفادات کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ اس کے ڈائریکٹر ابو فرید النجا بھی ایک عرب قوم پرست تھے۔ جب کبھی مرزا صاحب اس سنٹر میں جاتے تو اقبال اور قائد اعظم کی بات بڑے زور و شور اور بھرپور اعتماد سے کرتے تھے۔ ہندومت کی تاریخ اور ہندو کی اسلام دشمنی کو بڑے معتدل انداز سے پیش کرتے۔ انھوں نے پہلے تو ڈائریکٹر کو اپنے خیالات سے مانوس کیا۔ اپنی معلومات سے ان کا اعتماد حاصل کیا اور اپنے موقف کو پرزور انداز میں پیش کیا، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ بقول ڈاکٹر ظہور احمد اظہر وہی عرب قوم پرست ابو فرید پاکستان کے دوست بن گئے اور اپنی گفتگو میں اقبال اور قائد اعظم اور پاکستان سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرنے لگے اور جب فرید صاحب اپنی مدت پوری کر کے رخصت ہونے لگے تو مرزا صاحب نے انھیں شیروانی اور جناح کیپ پہنا کر رخصت کیا۔ فرعونی روایات کے گرویدہ ایک مصری قوم پرست کی یہ کایا کلپ پروفیسر محمد منور کی 'کرامت' تھی کہ ایک عرب قوم پرست مسلمان ہو گیا۔۱۰۱

قائد اعظم اور ان کی پاکستان کے ساتھ وابستگی کے اظہار کے لیے ان کے ایک خواب کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ جو مرزا صاحب نے اپنے نواسے متین صلاح الدین

کے سامنے بیان کیا:

ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ قائداعظم جلسے سے خطاب کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ قائداعظم سٹیج کی طرف بڑھنے لگے' لوگوں سے ملے' میں نے بھی انھیں سلام کیا لیکن وہ اس کا جواب دیے بغیر آگے بڑھنے لگے۔ میں بہت دل برداشتہ ہوا اور سٹیج پر جانے کے بجائے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ قائداعظم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ قائداعظم سٹیج پر پہنچے اور تقریر کا آغاز کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگے: منور کہاں ہے؟ قائداعظم کی نظر مجھ پر پڑی تو مجمع کو چیرتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے۔ گلے ملے اور اپنے ساتھ لے کر سٹیج پر پہنچ گئے۔۱۰۲

آپ اسلام کی حقانیت اور بالادستی اور غالب ہو کر رہنے کی قرآنی خوش خبریوں پر گہرا یقین رکھتے تھے اور بظاہر مایوس کن حالات سے' کبھی دل برداشتہ نہ ہوتے۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی بیان کرتے ہیں کہ افغانستان کے جہاد کے بارے میں انھوں نے بہت پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ روس شکست کھا کر یہاں سے نکلے گا۔ اس وقت کوئی بھی اس پیشین گوئی پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔۱۰۳

پروفیسر محمد منور کی اس بصیرت اور ہمہ جہتی کا راز ان کی کمٹ منٹ میں تھا۔ مزید برآں خدا تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی قوت اور صلاحیت بھی عطا کی تھی۔۱۰۴

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد' جب جنرل محمد ضیاء الحق نے فوجی حکمران کی حیثیت سے ملک کا نظم و نسق سنبھالا تو آپ بہت خوش ہوئے۔ کہتے ہیں کہ:

میں نے تو اسے تقریر سے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو چھ جولائی کو اس کی

تقریر سنی تھی جو مجھے پسند آئی تھی جس میں انھوں نے یہ کہا کہ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ میں جو اسلامی جذبہ ابھرا ہے، میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کی وجہ سے میں نے ضیاء الحق کو پسند کیا اور ایک بات واضح ہوگئی کہ وہ میرے دھڑے کا ہے۔ یعنی اس کے جملے نے مجھے اطمینان دلا دیا کہ وہ دشمنوں کے دھڑے کا نہیں ہے۔ یہیں سے میری ضیاء پسندی شروع ہوگئی۔ ۱۰۵

پروفیسر محمد منورؔ ضیاء الحق کی آمریت کو نام نہاد جمہوریت سے بہتر سمجھتے تھے اور ڈاکٹر شبلی کے نزدیک، جنرل ضیاء سے ان کی اس عقیدت کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو اس کے نفاذِ اسلام کے ارادے، دوسرے ضیاء الحق کی وجہ سے پاکستان نے افغان روس جنگ میں افغانیوں کی مدد کی۔ اسی طرح کشمیر کی جنگِ آزادی، ضیاء کے ذہن کی پیداوار ہے اور بنگلہ دیش کو بھی اسی نے ہندستان کے خلاف کھڑا کیا۔ ۱۰۶

آپ کی کتاب بعنوانِ مشاہدۂ حق کی گفتگو آپ کی 'ضیاء پسندی' کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ ضیاء الحق نے پاکستان کو روس سے بچا کر اپنے دور کے صلاح الدین ایوبی کا کردار ادا کیا۔ ۱۰۷

الغرض پاکستان کی بقا اور استحکام کے لیے پروفیسر محمد منور صاحب نے جو پرخلوص کاوشیں کیں اس کے پس پردہ ایک دردمند پاکستانی اور سچے اور پکے مسلمان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ہندو ذہنیت سے بخوبی شناسا تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے روابط اور ہندومت کے پس منظر، ہندو ذہنیت اور ہندوؤں کی تاریخ پر آپ نے دقتِ نظر سے تحقیق کی تھی۔ بقول ڈاکٹر شبلی، آپ اس دور کے سب سے بڑے ہندو شناس تھے۔ ۱۰۸ وہ ہندو ذہنیت پر گھنٹوں گفتگو کر سکتے تھے۔

خواجہ عابد نظامی رقم طراز ہیں:

ان کا مطالعہ اس قدر وسیع اور طرزِ استدلال اس قدر موثر ہوتا تھا کہ مخاطب بالآخر

مشرف بہ پاکستان' ہوجاتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر پاکستانی کو ہندو کی اصل کو ضرور سمجھنا چاہیے اور ہمہ وقت اس کے پُر فریب ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔۱۰۹

ہندو ذہنیت اور بھارت کی پاکستان دشمنی کا آپ کتنا ادراک رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ آپ کی دو کتابوں دیوارِ برہمن Dimensions of Movement Pakistan اور بہت سے مضامین سے ہوتا ہے۔ دیوارِ برہمن بقول زیڈ اے سلہری:

> نظریہ پاکستان کی کہانی ہے۔ جس کے اصل مخاطب وہ نوجوان ہیں' جنھوں نے ملک وملت کی جنگ لڑنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔۱۱۰ اور بقول نعیم صدیقی:
>
> اس دیوارِ برہمن پر تحقیق کرنے اور اس پر کدال چلانے والا پہلا شخص منور مرزا نکلا ہے۔۱۱۱

بھارت کی دشمنی کو بے نقاب کرنا' پروفیسر محمد منور صاحب کی زندگی کا مشن تھا' چنانچہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے لیے اہم بن جاتیں۔ جب کبھی بھارت اور پاکستان کا کرکٹ میچ ہورہا ہوتا' تو آپ بہت پر جوش ہوجاتے۔ شوروغل آپ کو سخت ناپسند تھا مگر ایسے مواقع پر آپ بچوں کے شور کی بھی پروانہ کرتے۔۱۱۲

دراصل یہ ان کی نظریاتی وابستگی تھی جس بنا پر وہ ہمیشہ بین الاقوامی امور' حالات حاضرہ' بھارت اور اسرائیل کے عزائم' امت مسلمہ خصوصاً پاکستان کے خلاف یہودیوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ جیسے موضوعات۱۱۳ پر کھل کر بولتے یا تقریر کرتے ..... اور اس معاملے میں وہ کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کی روایت ہے کہ:

> ایک مرتبہ ایک وزیر برائے مذہبی امور نے آپ کو اسلام آباد میں ایک اہم

ادارے کی سربراہی سونپنا چاہی۔مرزا صاحب نے ہم سے مشورہ طلب کیا۔اگر چہ ہماری بہت خواہش تھی کہ مرزا صاحب اسلام آباد آجائیں۔مگر مشورہ تو امانت کا متقاضی تھا' لہٰذا میں نے کہا' کہ اس عہدے کے ساتھ اگر چہ ٹرانسپورٹ' رہائش' ملازمین' ٹیلی فون اور اچھی تنخواہ جیسی مراعات ملیں گی' مگر جس بے باکی کے ساتھ اس وقت آپ نوائے وقت میں لکھ رہے ہیں' اس طرح نہ لکھ سکیں گے۔اس پر مرزا صاحب نے معذرت کر لی۔۱۱۴

یہ نظریاتی وابستگی ہی تھی جس کی بنا پر انھوں نے ہمیشہ نوائے وقت میں لکھنا پسند کیا۔ ان کے کچھ شاگرد جنگ اخبار سے وابستہ تھے' اور انھیں یہ ترغیب دیتے رہتے تھے کہ آپ بھی جنگ سے وابستہ ہو جائیں' لیکن مرزا صاحب نے اس تجویز کو ہمیشہ سختی کے ساتھ رد کر دیا۔وہ نوائے وقت کو نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کا امین سمجھتے تھے۔ نوائے وقت کو وہ پاکستان کے حوالے سے پسند کرتے تھے۔پاکستان کا حوالہ ہمیشہ مرزا صاحب کے دل میں زم زم گوشہ پیدا کر دیتا تھا۔

ویسے تو حفیظ جالندھری سے ان کے شخصی تعلقات بھی تھے' مگر حفیظ ایک اسلامی اور ملّی شاعر تھے اور پاکستان کے قومی ترانے کے خالق تھے' اس لیے پروفیسر محمد منور کے لیے بہت محترم تھے۔ایک بار جب انھیں موقع ملا تو انھوں نے وزیر اعظم نواز شریف سے کہا:

آپ جانتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔مگر یہ عظیم قومی شاعر ماڈل ٹاؤن کی ایک کچی قبر میں امانتاً دفن ہے۔چند لاکھ روپے لگا کر کسی خوب صورت جگہ پر اس کا ایک مزار بنا دیں' تو خدا آپ کو عزت دے گا۔

چنانچہ ان کی اس تحریک پر نواز شریف نے مینار پاکستان کے قریب حفیظ جالندھری

کے مزار کی تعمیر کا حکم دے دیا۔۱۱۶

یہ پاکستان سے محبت اور نظریاتی وابستگی ہی تھی جس کے سبب' کسی قومی حادثے یا ملّی سانحے کے موقع پر وہ شدید رنجیدہ خاطر ہو جاتے (حالاں کہ وہ کسی ذاتی نقصان' صدمے یا تکلیف کو بڑے حوصلے کے ساتھ برداشت کر جاتے تھے) ان کے احباب کے مطابق دو مواقع پر انھیں شدید دکھ اور غم کی کیفیت میں دیکھا گیا۔ ایک تو سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر اور دوسرے جنرل ضیاءالحق کی شہادت کے روز۔۱۱۷ پروفیسر محمد سلیم صاحب روایت کرتے ہیں کہ جب بنگلہ دیش الگ ہوا تو میں نے انھیں عملاً روتے ہوئے دیکھا ہے۔۱۱۸ اگر پاکستان کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملتی تو بہت خوش ہوتے' پاکستان نے ایٹمی دھماکا کیا تو اس روز ان کی مسرت دیدنی تھی۔ پاکستان' بھارت کو ہاکی یا کرکٹ میں شکست دیتا تو یہ امر بھی ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا۔

پروفیسر محمد منور طبعاً ایک قناعت پسند اور درویش منش انسان تھے۔ انھیں دنیاوی مناصب اور جاہ و حشمت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ روپے پیسے کے لالچ اور مال و متاع کی ہوس سے وہ کوسوں دور تھے۔ بقول طارق مجید: ''مادیت' تصنع اور تکبر کے اس دور میں بھی وہ فقر و قناعت پر راضی تھے۔''۱۱۹ ان کے ایک عزیز شاگرد اور دوست ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

> نام و نمود اور شہرت کی بجائے وہ گوشہ نشینی کو پسند کرتے تھے۔ اقبالیات اور پاکستانیات پر لیکچروں کے لیے انھیں دنیا بھر سے دعوت نامے آتے تھے' جنھیں وہ محض ملکی و ملی خدمت کے جذبے کے تحت قبول کرتے' اور اسے پیغام پھیلانے کا ذریعہ سمجھتے۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ خاص طور پر بیرونِ ملک ایسی تقریبات کے منتظمین نے جب بھی کوئی مالی

اعزازیہ دینے کی کوشش کی' مرزا صاحب نے ہمیشہ نہایت خوش اسلوبی سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت کو دولت کی چمک اور روپے کی کشش سے محروم رکھا تھا۔۱۲۰

دراصل پروفیسر منور ایک بے غرض اور بے نفس انسان تھے۔ ان کی زندگی' ان کے شب و روز اور ان کا رہن سہن' ان کے مزاج کی سادگی' قناعت پسندی اور درویشی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے ایک مداح کموڈور (ر) طارق مجید کہتے ہیں کہ ایک بار مجھے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا' اس زمانے میں وہ ۲۱ ویں گریڈ میں تھے' مگر آپ اس پرانے اور چھوٹے گھر میں انتہائی سادگی سے رہ رہے تھے۔ دل کو تقویت ہوئی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ان جیسے مردانِ درویش موجود ہیں۔۱۲۱

سرکاری ملازمت کے دوران وہ مختلف حکمرانوں سے کسی نہ کسی طور قریب رہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق سے ۶'۵ بار ملاقات ہوئی۔ وہ ان سے بہت ادب و احترام سے پیش آتے تھے۔ اسی طرح سے وزیراعظم نواز شریف بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے علمی مرتبے کے قائل تھے۔ آپ چاہتے تو حکمرانوں سے کوئی بھی مطالبہ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ بات آپ کے علمی وقار اور منصب کے خلاف تھی۔ اس ضمن میں جناب ذوالقرنین کہتے ہیں:

سیاست' صحافت اور بیوروکریسی کے شعبوں میں کرتا دھرتا افراد سے زندگی بھر ان کا تعلق اور دوستیاں قائم رہیں' لیکن انھوں نے اپنے تعلقات کو کبھی ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا گوارا نہ کیا۔۱۲۲

ان کی بے غرضانہ افتادِ طبع کے سلسلے میں ڈاکٹر صفدر محمود بتاتے ہیں کہ' ایک مرتبہ مرزا صاحب کو ایک قومی کنونشن میں تقریر کے لیے مدعو کیا گیا۔ صدر جنرل ضیاء الحق کی صدارت تھی۔ تقریب کے بعد صدر ضیاء الحق مہمانوں میں گھل مل گئے۔ پروفیسر

صاحب سے نہایت گرم جوشی سے ملے' ان کی خیریت دریافت کی' اور پوچھا: پروفیسر صاحب' میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ پروفیسر صاحب نے بلا سوچے سمجھے فوراً جواب دیا: ذرا اپنے سٹاف سے کہیے کہ مجھے غسل خانے کا راستہ دکھا دیں۔ صدر صاحب مسکرا دیے۔۱۲۳

اس واقعے سے جہاں پروفیسر صاحب کی بے نیازی ظاہر ہوتی ہے، وہاں ان کی ظرافتِ طبع کا بھی پتا چلتا ہے۔

مرزا صاحب کوئی بہت امیر کبیر یا دولت مند شخص نہیں تھے' مگر اللہ نے انھیں' علامہ اقبال ہی کی طرح فقر و غنا کی دولت عطا کی تھی۔ دوسرے وہ ایک ہمدرد اور مشفق انسان تھے۔ خدمت خلق اور دردمندی کا جذبہ ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر تھا۔ وہ مستحق طلبا کی امداد کے لیے خصوصی طور پر کمربستہ رہا کرتے تھے۔ بشیر حسین بر اس بیان کرتے ہیں کہ وہ انجینئرنگ کے ایک طالب علم کی ماہوار مدد کیا کرتے تھے' مگر اسے یہ کہا کہ یہ قرض ہے جو تمھیں برسر روزگار ہو کر ادا کرنا ہوگا۔ وہ نوجوان تعلیم مکمل کر کے کہیں ملازم ہو گیا اور مرزا صاحب سے رابطہ کر کے رقم ماہوار اقساط میں واپس کرنا چاہی تو مرزا صاحب نے کہا کہ:

یہ درست ہے کہ وہ رقم تم پر قرض تھی' لیکن اب اس قرض کو اتارنے کا طریقہ یہ ہے کہ جیسے میں نے مشکل حالات میں تمھاری مدد کی' اسی طرح تم کسی ضرورت مند کی مدد کرو' اور نیکی اور اچھائی کی شمع جلائے رکھو۔۱۲۴

یہ تو ایک طالب علم کا ذکر تھا۔ مرزا صاحب' حسبِ توفیق متعدد ضرورت مند لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ مالی لحاظ سے بہت مستحکم نہ تھے' مگر ان کا دل بہت بڑا تھا۔ جس ماہ آپ کی وفات ہوئی تب بھی یہ اطمینان کر لیا کہ جن لوگوں کو ماہوار رقم جاتی ہے' اس کے منی آرڈر چلے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ معمول ہوتا تھا کہ دائیں

ہاتھ سے دو اور بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے۔ وہ کن لوگوں کو کتنی رقم دیتے تھے' اس کا ذکر کبھی اہلِ خانہ سے بھی نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیٹی کو پتا چلا کہ وہ خاموش امداد کرتے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اپنے بھانجے معظم کو یہ ذمہ داری سونپ گئے ہیں کہ وہ ان کی وفات کے بعد بھی یہ مدد جاری رکھیں۔ ۱۲۵

اللہ تعالٰی نے آپ کو فیاضانہ طبیعت عطا کی تھی۔ جہاں نظریے کا مسئلہ ہوتا' وہاں وہ اور زیادہ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ پروفیسر سلیم منصور خالد کی کتاب البدر کی تعارفی تقریب (۱۶ دسمبر ۱۹۸۵ء) میں خطاب کے لیے آئے۔ یہ کتاب مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان بنگالیوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ مرزا صاحب یہ کتاب پڑھ کر ان جاں نثارانِ پاکستان کی قربانیوں سے بہت متاثر تھے۔ مذکورہ کتاب کے بنگالی اور سندھی تراجم' نیز وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کے لیے پندرہ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔ ۱۲۶

پروفیسر محمد منور نے اپنے علمی اور تدریسی سفر کا آغاز' پروفیسر بننے کے شوق کو پورا کرکے کیا۔ (اس کا تفصیلی ذکر سابقہ اوراق میں آچکا ہے) شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوجانے کے بعد آپ کی فکری و ذہنی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ آپ نے ایک طرف تو علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں اور دوسری طرف بطور استاد بھی اپنے فرائض کو بطریقِ احسن نبھایا۔ آپ صرف نصاب پڑھانے والے استاد نہ تھے' آپ ایک خاص فکر کے داعی تھے اور اپنے شاگردوں کے ذہنوں میں وہی مثبت فکر راسخ کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔

اقبال اور فکرِ اقبال کے توسط سے نظریۂ پاکستان کی ترویج اور فروغ آپ کی زندگی کا مشن تھا۔ لہٰذا آپ ساری عمر اپنے پیغام کو اپنے طلبا تک پہنچانے کی سعی کرتے رہے

۔اس لیے آپ آدم گر اور شخصیت ساز استاد تھے ۔آپ نے تدریس کو بطور ایک مسلک اور ایک مشن اپنایا تھا ۔۱۲۷ طلبہ کے نصابی اسباق مکمل کرانے کے ساتھ ساتھ ان میں حقیقی علمی مہارت پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے ۔آپ نے کبھی محض قیل وقال سے اور زبانی کلامی شاگردوں کی تربیت نہیں کی بلکہ خود ایک فکر کی زندہ مثال بن کر ایک دلی جذبے اور لگن کے ساتھ اپنے طلبا کی تربیت کی کوشش کرتے تھے ۔۱۲۸

پروفیسر محمد سلیم کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو میرا تلفظ درست کرنے کی فکر رہتی تھی ۔ انھوں نے مجھ سے ایک کاپی بنوائی' جس کے ذریعے وہ میرا تلفظ درست کیا کرتے تھے ۔وہ ایک طرح سے میرے استاد تھے ۔۱۲۹

تربیت اور اصلاح کے لیے کوئی وقت اور جگہ مقرر نہ تھی ۔وہ اپنے شاگردوں اور بے تکلف دوستوں سب کے خیر خواہ تھے' جہاں کہیں کوئی شخص تلفظ میں غلطی کرتا' وہ فوراً اس کی اصلاح کر دیا کرتے ۔۱۳۰ گھر میں بھی تلفظ کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہتے تھے ۔گفتگو میں انگریزی کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے ۔۱۳۱ جس زمانے میں اورینٹل کالج میں شعبہ اقبالیات کے سربراہ تھے' بعض اساتذہ کو اکسایا کرتے تھے کہ آپ مجھ سے عربی یا فارسی پڑھ لیا کریں ۔دونوں زبانیں بہت آسان ہیں ۔ ۱۳۲

پروفیسر محمد منور ایک کامیاب معلم اور صاحبِ علم استاد تھے ۔انھیں بہت سے مضامین پر عبور حاصل تھا ۔جو مضمون بھی پڑھا رہے ہوتے' یوں محسوس ہوتا کہ شاید اسی کے ماہر ہیں ۔لائل پور کالج میں بوقتِ ضرورت عربی کا مضمون بھی پڑھا دیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر صدیق شبلی راوی ہیں کہ میں نے ان سے ایف اے میں اردو پڑھی' اور بی اے میں عربی کی لٹریری ہسٹری کا طالب علم رہا ۔دونوں زبانیں انھوں نے اتنے ڈوب کر

پڑھائیں کہ ہمیں یہ سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی کہ یہ اصل میں کس مضمون کے استاد ہیں، یعنی ہر مضمون کا حق ادا کر دیتے تھے۔۱۳۳ آپ کو تاریخ اسلام، عربی، فارسی اور اردو سبھی مضامین پر عبور حاصل تھا۔ ان کی خوش گفتاری میں عالمانہ وقار کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ استاد اور مدرس کی مشفقانہ وضاحت، دل نشینی اور اپنے موضوع پر وہ دسترس بھی شامل تھی جو بات کو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا درجہ عطا کرتی ہے۔
۱۳۴

اوپر عربی اور فارسی کا ذکر آیا تو یہ بتانا مناسب ہوگا کہ آپ کو دونوں زبانوں پر اچھی دسترس حاصل تھی۔ اس قدر کہ دونوں میں بخوبی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ فارسی زبان کی باقاعدہ تعلیم کہیں سے حاصل نہیں کی تھی، مگر اپنے طور پر فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور فارسی کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی بتاتے ہیں کہ ایک بار گولڑہ شریف کے پیر نصیر الدین اورینٹل کالج تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک یادگار نشست رہی، جس میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید اکرم شاہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، صوفی فقیر محمد افضل مرحوم اور دیگر کئی حضرات شریک ہوئے۔ اس دن مرزا صاحب نے فارسی کے نہایت عمدہ ۳۷ شعر سنائے۔ سب لوگوں نے انھیں دل کھول کر داد دی۔۱۳۵

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے آپ نے اورینٹل کالج کے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے ایم اے کیا تھا، پھر اپنے طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ اس طرح اتنی مہارت ہوگئی کہ کئی عربی کتابوں کے ترجمے کیے۔ مزید برآں آپ عربی زبان میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ پہلی سربراہی اسلامی کانفرنس منعقدہ، لاہور کے موقع پر انھوں نے عربی میں بڑی ایمان افروز نظمیں کہیں۔۱۳۶ پروفیسر کبیر احمد مظہر (استادِ عربی اورینٹل کالج لاہور) کہتے ہیں کہ جدید عربی زبان میں ان کی خوب صورت نظموں کو

دیکھ کر ہمیشہ یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید انھوں نے عرب ممالک میں رہ کر عربی زبان پر عبور حاصل کیا ہے۔۱۳۷

دراصل پروفیسر محمد منور بچپن ہی سے شاعری کی جانب ایک طبعی رجحان رکھتے تھے۔ اردو میں تو ان کا مجموعۂ کلام غبارِ تمنا چھپ چکا ہے۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی اشعار کہتے تھے۔ آپ کی تازہ اردو اور فارسی نظمیں بالعموم 'نوائے وقت میں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن آپ نے اپنے شاعر ہونے کا زیادہ چرچا کبھی نہیں کیا اور مشاعروں میں بھی نہیں جاتے تھے' لیکن مشاعروں میں نہ جانے اور اپنا کلام نہ سنانے کی یہ روایت ۱۹۹۱ء میں چین کے سفر کے دوران اس وقت ٹوٹ گئی جب ڈاکٹر سعید اختر درانی نے ہوٹل گران پی تان میں ایک محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا اور پروفیسر منور کو اس مشاعرے کی صدارت پر آمادہ کر لیا۔ جاوید اقبال مہمان خصوصی تھے۔ یہ اردو' فارسی' عربی اور فرانسیسی کا ایک کثیر لسانی مشاعرہ تھا' جس کے آخر میں حاضرین کے اصرار پر پروفیسر منور صاحب نے بھی اپنے عہد شباب کا کچھ کلام سنایا۔۱۳۸

پروفیسر محمد منور کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ایک عمدہ مقرر اور خوش بیان خطیب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں قلم کی قوت کے ساتھ زبان کی بے پناہ صلاحیت بھی بخشی تھی۔ آپ ایسے مردِ حق تھے جنھوں نے اپنے جوہرِ خطابت سے اپنے مقصد اور نظریے کی بھرپور انداز میں تشہیر کی۔ وہ نہایت موثر انداز میں تقریر کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک روانی' متانت اور دھیما پن ہوتا تھا۔ بات سنبھل کر کرتے' اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کرتے اور موضوع کا حق ادا کر دیتے اور سننے والے محسوس کرتے کہ واقعتاً مرزا صاحب انھیں کچھ سکھانے اور سمجھانے کے لیے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ پروفیسر سید محمد کبیر احمد مظہر بیان کرتے ہیں:

کئی مرتبہ مختلف علمی مجلسوں میں ان کا خطاب سنا' یوں لگتا تھا' کہ خیالات وافکار کا ایک زوردار دھارا ہے' کہ بہتا چلا آ رہا ہے۔روانی اور سلاست حیران کن تھی۔جب تک بولتے سامعین ہمہ تن گوش رہتے۔نگاہیں مسلسل ان کے چہرے پر ٹکی رہتیں۔ صدق گوئی کا عنصر غالب ہوتا۔۱۳۹

آپ لائل پور میں ہر سال مجلس اقبال کے جلسوں میں تقریر کیا کرتے۔بعدازاں ۲۷ سال تک مرکزیہ مجلسِ اقبال لاہور کے مقرر رہے اور متعدد مواقع پر ''شام ہمدرد'' میں تقریر کی۔افواجِ پاکستان کی دعوت پر اعلیٰ افسروں کو لیکچر دیے۔یومِ اقبال' یومِ قائداعظم اور یومِ پاکستان جیسے اہم مواقع پر یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں تقاریر کیں ۔

تقریر کرنے کے لیے جس قلبی اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے' وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء میں جب وطن ٹوٹ گیا تو ۲۵ فروری ۱۹۷۲ء کو یومِ حمید نظامی تھا' اس کے دو ماہ کے بعد ایک تقریب میں شرکت کے لیے جناح ہال جارہا تھا' بھٹو کے عنانِ سلطنت سنبھالنے کے بعد یہ دائیں بازو والوں کا پہلا جلسہ تھا ۔میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ میرے کان میں ایک آواز پڑی۔ایک صاحب دوسرے صاحب سے کہہ رہے تھے: آج دیکھیں گے پاکستان کے جو''مامے''ہیں' بھلا سوشلزم کے خلاف کیسے بولتے ہیں۔یہ جملہ سن کر مجھے سخت تکلیف ہوئی۔میں نے دل میں کہا: یا مولا! اگر میرا نظریہ' میرا ایمان ٹھیک ہے تو پھر مجھے توفیق دے کہ آج میں اس موضوع پر بولوں۔میں نے اس سے پہلے سوشلزم کے موضوع پر کبھی تقریر نہیں کی تھی۔میں سوشلزم پر حملہ کرنے کی بجائے اپنی باتیں کرتا رہتا تھا' مگر اس دن میں نے چالیس منٹ کی تقریر کی اور اللہ نے مجھے ایک نکتہ سجھا دیا جسے میں پھیلاتا چلا گیا۔اس کے بعد مولانا عبدالستار نیازی کو تقریر کرنا تھی' مگر انھوں نے صرف یہ

کہہ کر اپنی بات ختم کر دی کہ منور نے میری ترجمانی کر دی ہے۔اس کے بعد نسیم احمد آئے جو پیپلز پارٹی کی طرف سے انفارمیشن سیکریٹری تھے اور انھوں نے سوشلزم کے حق میں بولنا چاہا' مگر ابھی ان کا پہلا جملہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' لوگوں کو بٹھایا گیا اور نسیم احمد کو پھر بات کرنے کا موقع دیا گیا مگر پھر وہ اس بارے میں کچھ نہ کہہ سکے' اور سٹیج سے اتر آئے۔

اگلے روز آغا شورش کاشمیری کی ملاقات مرزا صاحب سے ہوئی تو وہ انھیں کہنے لگے:

مرزا صاحب! آپ پر اللہ کی دین ہے' آپ کو اللہ نے کیا تاثیر عطا فرمائی ہے۔میں دیکھ رہا تھا کہ جب آپ تقریر کر رہے تھے' تو وہ لوگ جو پیپلز پارٹی کے تھے اور آدھے سے زیادہ ہال میں بھرے ہوئے تھے' وہ بھی تائید میں سر ہلا رہے تھے۔خدا کی قسم اگر یہی بات میں کہتا تو ڈیسک ٹوٹ جاتے۔سر پھوٹ جاتے اور خدا جانے کیا ہو جاتا۔مگر آپ نے انھیں سب کچھ کہا اس کے باوجود وہ سر ہلاتے رہے۔۱۴۰

مرزا صاحب اردو کے علاوہ فارسی' انگریزی اور عربی زبان میں بھی روانی سے تقریر کر لیتے تھے۔عربی میں تقریر کرنے کا پہلا تجربہ آپ کو مصر میں ہوا۔اس خوشگوار تجربے کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

حادثہ یہ ہوا کہ وہاں جا کے مجھے بھی عربی آ گئی۔میں نے زندگی میں پہلی بار عربی میں تقریر کرنے کی جسارت کا ''ارتکاب'' کیا' یہ قاہرہ یونی ورسٹی میں جلسہ یوم اقبال تھا۔ ....میں نے علامہ اقبال کے کلام پر عربی اثرات کے ضمن میں کوئی دس منٹ اظہارِ خیال کیا اور عربی میں اظہارِ خیال کیا اور حیرت ہے کہ ''گردم وشد''۔۱۴۱

ایک بڑے آدمی' خصوصاً ایک عالم کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ دعوے نہیں کرتا۔اپنے آپ کو ادنٰی اور معمولی سمجھتا ہے اور اپنی قابلیتوں کو نمایاں کرنے کا شوق نہیں رکھتا اور

عجز و انکسار سے کام لیتا ہے۔ پروفیسر محمد منور ایک کامیاب مقرر تھے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام' اردو ادب' فارسی شاعری' اقبال' قائد اعظم' نظریہ پاکستان' ہندو ذہنیت وغیرہ کے بارے میں تو ان کا مطالعہ وسیع تھا' گاندھی' نہرو' پٹیل اور ہندوؤں کی تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات کسی سے کم نہ تھیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی تحریروں میں بھی انکسار سے کام لیتے تھے۔ ایقانِ اقبال کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

حضرت علامہ اقبال کے بعض نظریات کو سمجھنے کی یہ ناکام کوشش آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں' من آنم کہ من دانم' موضوعات بڑے اہم ہیں۔ ان تک صحیح معنوں میں میرے ذہن کو رسائی حاصل نہیں۔ لہٰذا اہلِ علم و دانش دیکھ لیں گے کہ مجھ سے کیا کیا کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔۱۴۲

یہ محض ان کا انکسار ہے' ورنہ یہ مسلّم ہے کہ محمد منور' اس دور کے ایک بڑے اقبال شناس اور فکرِ اقبال کے کامیاب مفسر اور شارح تھے۔ اسی طرح' علامہ اقبال کی فارسی غزل' کے ابتدائیے میں تحریر کرتے ہیں:

(کتاب مرتب کرنے) کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے حضرتِ علامہ کی فارسی غزل سے شغف نہ تھا' شغف تھا' اور بے حد' مگر میں خود کو ہرگز اس قابل نہ جانتا تھا کہ اس موضوع کا حق ادا کر سکوں۔۱۴۳

مرزا منور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے خوش طبع اور مجلسی آدمی تھے۔ ہم خیال اور ہم مزاج دوستوں اور بزرگوں سے گفتگو اور تبادلۂ خیال انھیں بہت مرغوب تھا۔ ایک زمانے میں وہ بارود خانہ (حویلی میاں امیر الدین) جایا کرتے تھے' جہاں کبھی تو میاں امیر الدین کے ڈرائنگ روم میں اور کبھی میاں ایم اسلم کے دیوان خانے میں منعقد ہونے والی مجالس میں شریک ہوتے۔ ان مجلسوں میں سیاست اور ادب کے بہت سے پہلوؤں پر سیرِ حاصل گفتگو ہوتی تھی۔۱۴۴

وہ 'زندگی زندہ دلی کا نام ہے' کے قائل تھے۔ مجلس آرائی دراصل ان کی زندہ دلی کا ایک پہلو تھا' بقول پروفیسر غلام الثقلین نقوی:

وہ محفل ساز اور محفل آرا' نہایت شایستہ کلام اور بذلہ سنج تھے۔۱۴۵

ان کی خوش مزاجی اور خوش طبعی کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوتا تھا جو ان کی محفل میں شریک ہوتا۔ وہ ایک شرارت آمیز دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی گفتگو میں پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے۔'۱۴۶

اتوار کو ان کے ہاں دوست احباب جمع ہوتے تھے۔ اس محفل میں بعض اوقات ان کے شاگرد بھی موجود ہوتے۔ حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ دلچسپ واقعات اور لطائف سے محفل بڑی پُرلطف اور شگفتہ ہو جاتی۔ مرزا صاحب ایک شرارت آمیز دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی گفتگو میں ایسی پھلجھڑیاں چھوڑ جاتے کہ مخاطب اس تعلقِ خاطر کی گرمی اور خلوص کو محسوس کر سکتا تھا' جو وہ اس کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ پروفیسر محمد سلیم روایت کرتے ہیں:

ہماری محفل بہت خوب صورت ہوتی تھی۔ جس میں ایجوکیشن بھی ہوتی تھی اور تفریح بھی۔ ہم بہت بے تکلف ہو کر وہاں باتیں کرتے تھے۔ یوسف عرفان ہمارے میزبان ہوا کرتے تھے۔ ان کا نام میں نے اور مرزا صاحب نے 'علامہ صاحب' رکھا ہوا تھا۔ میں کبھی پوچھتا کہ علامہ صاحب کہاں گئے ہیں' تو مرزا صاحب کہتے وہ تو آپ کے لیے 'نان نفقہ' لینے گئے ہوئے ہیں۔ اس سے مراد کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔۱۴۷

پروفیسر محمد مظفر کا بیان ہے کہ خورد و نوش کا قابلِ تحسین انتظام ہوتا تھا۔ جو اس محفل میں نہ آ سکتا تھا اس کو 'اتفاقیہ رخصت' طلب کرنی پڑتی تھی۔ محفل خالص علمی محفل ہوتی تھی' جس میں سیاست سے لے کر عمرانیات اور مذہبیات تک کے موضوعات پر

گفتگو ہوتی تھی۔۱۴۸

بقول ڈاکٹر وحید قریشی: پروفیسر محمد منور 'خوش گفتار و محفل آرا' اور 'یاروں کے یار' تھے۔ ۱۴۹ ایک سنجیدہ عالم اور سکالر ہونے کے باوجود حسبِ موقع وہ ظرافت سے کام لیتے تھے۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی روایت کرتے ہیں کہ آپ اپنے شاگردوں سے بالخصوص محبت کرتے تھے۔ لائل پور میں' میں بھی ان کے خاص حلقے میں شامل تھا' اسے وہ 'حلقہ مرزائیت' کہتے تھے۔۱۵۰

پروفیسر محمد سلیم بیان کرتے ہیں کہ فیصل آباد میں آپ مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ لائل پور کالج میں آپ اپنے دوستوں کے ساتھ کالج کینٹین جاتے تو ایک خاص قسم کے بسکٹ منگاتے۔ آپ ازراہِ تفنن ان بسکٹوں کو 'مرزائی بسکٹ' کہا کرتے تھے۔۱۵۱ وہ سارک تنظیم کو بھارت کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے اور اس کے کردار سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ وہ سارک کو 'شارک' کہا کرتے تھے۔۱۵۲ ان کی محفلوں میں لطیفہ بازی بھی ہوتی اور بات سے بات نکلتی چلی جاتی۔ مرزا صاحب اپنی خوش طبعی سے حاضرین کو محظوظ کرتے۔۱۵۳

پروفیسر محمد منور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس اور نفاست پسند تھے۔ اچکن ان کا پسندیدہ پہناوا تھا۔ اچکن کا کپڑا ہمیشہ بہترین اور عمدہ خریدتے۔ سلائی میں غیر معمولی دلچسپی لیتے۔ ان کی بیٹی نزہت صلاح الدین بیان کرتی ہیں کہ: ایک بار ہسپتال جا رہے تھے' طبیعت کافی خراب تھی' لیکن انھوں نے براؤن سوٹ پہنا' براؤن ہی واسکٹ اور ٹوپی پہن لی۔ جوتا میں نے کالا دے دیا تو: بابا سے کہہ کر دور سے براؤن کھیڑی (چپل) نکلوا کر پہنی۔۱۵۴

وہ خوش خوراک بھی تھے۔ ان کو بہترین کھانا کھانے کی عادت تھی۔ پلاؤ بہت پسند تھا۔ ایک بار ایک شعر سنایا' جو ان کی حسِ ظرافت کا ثبوت بھی ہے:

پلاؤ بره چوبنی شہید کن خود را
که مرگ ہاے چنیں گاه گاه می آید

(اگر چھوٹے بکرے کا پلاؤ ملے تو کھا کھا کر شہید ہو جاؤں' ایسی موت کبھی کبھی ہی نصیب ہوتی ہے۔) مٹھائی میں انھیں 'پتیسا' بہت پسند تھا۔ از راہِ تفنن تپیسا (ت پ س ی ا) کہتے تھے۔ جب کبھی دفترِ نوائے وقت سے نکلتے تو ریڑھی والے سے گچک خرید لیتے۔ کہیں سے ریوڑیاں خرید لیتے اور کھاتے ہوئے پیدل گھر آ جاتے۔ ۱۵۵

دورانِ ملازمت جب لائل پور میں اکیلے رہتے تھے تو کبھی خود ہی پراٹھا بنا لیتے تھے۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ پراٹھا پیش کیا کرتے تھے' اور وہ پراٹھا اس قدر مزے دار ہوتا تھا کہ شاید کوئی خاتون بھی اس قدر مزے دار پراٹھا نہ بنا سکے۔ چائے یا سالن کے ساتھ پراٹھا بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ آخری دنوں میں ان کا معدہ کمزور ہو گیا۔ انھوں نے پھر بھی ایک روز پراٹھا بنوا کر کھایا۔ ۱۵۶

آپ کے ذاتی ملازم اورنگ زیب کا بیان ہے:

میں ان کا پرہیزی کھانا بنایا کرتا تھا۔ وہ زیادہ مزے دار نہیں ہوتا' تو کہتے تھے: بابا، آپ ہر روز ایک ہی طرح کا کھانا بناتے ہیں۔ کبھی کھانے کی شکل ہی تبدیل کر لیا کرو۔ کھانے پینے کے معاملے میں ایک آدھ دفعہ ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑ گئی' لیکن پروفیسر صاحب خود ہی منا بھی لیا کرتے تھے۔ ۱۵۷

جب وہ سانده میں رہتے تھے تو بالعموم پیدل ہی کالج اور یونی ورسٹی آیا جایا کرتے تھے۔ آپ کی ایک اے سی آر رپورٹ میں مشاغل کے کالم میں دو ہی مشاغل لکھے گئے۔ reading اور walking۔ اگلے سال کی اے سی آر رپورٹ میں reading اور walking کے ساتھ ایک تیسرے مشغلے writing کا بھی اضافہ ہو گیا۔ ۱۵۸

اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت مشفقانہ اور دوستانہ ہوتا۔ اس کے باوجود آپ کی شخصیت میں ایک رعب موجود تھا۔ ان کے سامنے کوئی بھی فرد ان کی طبیعت اور پسند کے برخلاف کام کرنے کی جرأت نہ کرتا' حالانکہ آپ سختی سے کام نہیں لیتے تھے' یا کوئی خاص روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ اس لیے عزیز و اقارب از خود ان کی مرضی اور منشا کے مطابق جملہ معاملات انجام دیتے۔ خاندان میں وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے' اس وجہ سے بھی ان کا احترام کیا جاتا' مگر بڑا بھائی ہونے کے ناطے انھوں نے اپنے تمام بہن بھائیوں اور عزیزوں کا بہت خیال رکھا۔ آپ کی نواسی عنبرین صلاح الدین بیان کرتی ہیں:

> نانا جان ہم سب کے ساتھ ایک اچھے دوست کی طرح تھے' لیکن ان کا رعب دبدبہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ ہمارے ہاں ان کے سامنے کوئی غلطی کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ ۱۵۹

> آپ کے لیے شور ناقابلِ برداشت تھا۔ بچوں کے شور وغل' اور غیر ضروری چیخنے چلانے پر قدرے خفا ہو جاتے۔ بالخصوص جب سونے کا وقت ہوتا اور کوئی بچہ ان کے کمرے میں چلا جاتا یا شور مچاتا تو بہت ناراض ہوتے۔ ۱۶۰

مطالعۂ کتب آپ کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کتابوں سے آپ کو دلی محبت تھی۔ ان کے کمرے اور بستر پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوتی تھیں۔ اور وہ ان کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ ملازمت کے ابتدائی دور میں جب آپ محکمۂ انہار کے کیرانہ ڈویژن سرگودھا میں تعینات ہوئے تو آپ کے سامان میں سب سے زیادہ کتابیں ہی تھیں۔ بیشتر وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ نیند کم ہی آتی تھی اور نیند کچی بھی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر نیند سے بیدار ہو جاتے تو سرھانے رکھے لیمپ کو جلاتے اور

کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتے۔۱۶۱

آپ کی بیٹی نزہت صلاح الدین کہتی ہیں کہ ابا جان کی شخصیت میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو کوئی بار ڈانٹتے بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اگلے دن ان سے ملنے دوبارہ آجاتے تھے۔شاید انھیں معلوم تھا کہ ان کا اس سے بہتر کوئی استاد اور نہیں ہو سکتا۔غصہ انھیں چند باتوں پر آتا تھا' لیکن اتنا شدید کہ پھر کوئی بول نہیں سکتا تھا۔کبھی کسی کام میں دو منٹ کی تاخیر ہوگئی تو ابا جان کا موڈ خراب۔ دوسری بڑی وجہ جس پر انھیں غصہ آتا تھا وہ شور تھا اور سب سے زیادہ غصہ تو انھیں اس وقت آتا تھا' جب ان کی کوئی کتاب یا تحریر اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی' لیکن عام حالات میں وہ نہایت ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔طویل علالت کے باوجود ایک اطمینان و سکون اور صبر و تحمل ان کی عادت کا حصہ رہا۔۱۶۲

پروفیسر محمد منور کے ذاتی ملازم اورنگ زیب نے ان کے بارے میں تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

وہ بڑے عظیم انسان تھے' میں سولہ سترہ سال ان کے ساتھ رہا ہوں۔انھوں نے کبھی میرے ساتھ ملازموں والا سلوک نہیں کیا..... کبھی کوئی کام کہتے' تو حاکمانہ انداز میں نہیں' بلکہ اس طرح کام کہتے تھے کہ جیسے درخواست کر رہے ہوں۔۱۶۳

پروفیسر محمد منور شخصی طور پر نہایت مضبوط دل اور حوصلے والے انسان تھے۔ اپنے غموں اور دکھوں کو کبھی دوسروں کے سامنے بیان نہیں کیا۔وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا ظرف اتنا بڑا اور وسیع ہوتا ہے کہ وہ اپنے دکھوں اور غموں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دکھوں کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیتے۔ذاتی تکلیف بہت حوصلے سے برداشت کرتے۔اپنی بیماری کے ایام میں

بھی واویلا نہیں کرتے تھے، بلکہ خاموش رہتے، صرف چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کرب کی حالت میں ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں جبکہ وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھے اور بیماریوں نے ہر طرف سے یلغار کر رکھی تھی، ان کے منہ سے صرف اللہ اکبر کی آواز ہی سنی گئی۔۱۶۴

نام ونمود سے نفور، شہرت سے بے نیاز پروفیسر محمد منور ایک سادہ مزاج سچے اور کھرے مسلمان تھے۔ پاکستانیت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا باطن دردوسوز سے معمور تھا۔ انھیں دنیا کے علائق سے دلچسپی نہ تھی۔ ان کی سادگی اور سنجیدگی، ان کے باطنی خلوص، اور دردمندی دل سوزی سے عبارت تھی۔ اپنی اولاد کو نصیحت کرتے کہ سادگی کو اپنا شعار بنانا۔ وہ کہتے کہ میں نے ساری عمر کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔ (مجھے بہت سی حکومتوں نے پیش کش کی تھی کہ میں ان سے مراعات حاصل کروں، لیکن میں نے پسند نہیں کیا۔ تم میرے بعد ایسا ہی کرنا۔۱۶۵)

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے یک رنگ کے اس شعر کے حوالے سے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

یک رنگ نے تلاش کیا ہے بہت سنو
مظہر سا اس جہاں میں کوئی مرزا نہیں ۱۶۶

حقیقت یہ ہے کہ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہیں، جو اپنے مقصد، نصب العین اور ملک وملت کی مخلصانہ اور بے لوث خدمت کریں۔ فکرِ اقبال کی ترویج آپ کا مقصدِ زندگی تھا۔ آپ نے فکرِ اقبال کی روشنی میں نظریۂ پاکستان کو نہایت عمدہ انداز سے پیش کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

پروفیسر صاحب کی طویل معلمانہ زندگی، اور ان کی جملہ علمی وعملی سرگرمیاں، خدمت

دین، ملت کی سربلندی، وطنِ عزیز کے استحکام وسرفرازی کی تمنا پر مرکوز ہیں۔ وہ قائداعظم کے عقیدت مند تھے، اور اپنی افتادِ ونہاد، گفتار وکردار، اور اپنے سارے جذبات ومحسوسات سمیت ایک سچے اور کھرے پاکستانی اور نظریۂ پاکستان کے ان تھک مفسر تھے۔ ۱۶۷

پروفیسر محمد منور جیسے لوگ معاشرے کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ پاکستانی قوم کے لیے فخر کا باعث تھے۔ ان کی زندگی پاکستان کے لیے تھی۔ انھوں نے علامہ اقبال کے پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ اسلام کی محبت اور عالمِ اسلام کے لیے دل سوزی ان میں رچی بسی تھی۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر ان کے کارنامے، روزِ روشن کی طرح چمکتے رہیں گے۔ معروف ادیب اور افسانہ نگار میرزا ادیب نے ایک بار لکھا تھا کہ میں پروفیسر محمد منور کا جب بھی تصور کرتا ہوں تو میرے سامنے روشنی کا ایک ایسا مینار آ جاتا ہے جو کئی راستوں کے سنگم پر کھڑا ہو اور اپنی روشنی ان تمام راستوں پر ڈال رہا ہو۔ ۱۶۸ یہ بات میرزا ادیب نے ۱۹۸۹ء میں اس وقت کہی تھی، جب پروفیسر صاحب حیات تھے، آج جب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان کے علمی اور اقبالیاتی کارناموں کا مینار بدستور اسی طرح روشن ہے اور اپنی روشنی سے ماحول کو منور کر رہا ہے۔

خدا ان کی روح کو آسودہ رکھے۔ (آمین)

حوالے اور حواشی

۱۔انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا‘ مرتبہ: قاسم محمود‘ ص ۳۲۲‘ ۳۲۳

۲۔بحوالہ Bio Data‘ جو اقبال اکادمی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

۳۔نزہت صلاح الدین سے گفتگو‘ بتاریخ ۴راگست ۲۰۰۲ء۔

۱۳۔انٹرویو‘ پروفیسر محمد منور‘ از: عمران نقوی۔ روزنامہ نوائے وقت‘ لاہور۔ ۵رنومبر ۱۹۹۲ء۔

۴۔پروفیسر محمد منور‘ روزنامہ عوام‘ فیصل آباد‘ ۲۶رنومبر ۱۹۹۲ء۔

۵۔انٹرویو‘ پروفیسر محمد منور‘ از: عمران نقوی۔ روزنامہ نوائے وقت‘ لاہور۔ ۵رنومبر ۱۹۹۲ء۔

۶۔ایضاً روزنامہ نوائے وقت‘ لاہور۔ ۵رنومبر ۱۹۹۲ء۔

۷۔بحوالہ ذاتی ڈائری‘ پروفیسر محمد منور‘ (۱۹۴۰)

۸۔بحوالہ ذاتی ڈائری‘ پروفیسر محمد منور‘ بتاریخ ۲۷رنومبر ۱۹۴۵ء۔

۹۔انٹرویو‘ پروفیسر محمد منور‘ از: امجد رؤف خاں‘ سیارہ ڈائجسٹ‘ لاہور‘ دسمبر ۱۹۹۰ء‘ ص ۵۔

۱۰۔بحوالہ سند‘ (میٹرک)‘ پنجاب یونی ورسٹی‘ لاہور۔

۱۱۔انٹرویو‘ پروفیسر محمد منور‘ از: امجد رؤف + ت ق ش‘ روزنامہ پاکستان‘ لاہور‘ ۱۳ فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۲۔انٹرویو‘ پروفیسر محمد منور‘ سیارہ ڈائجسٹ‘ دسمبر ۱۹۹۰ء‘ ص ۳‘ ۴۔

۱۳۔نزہت صلاح الدین سے گفتگو‘ بتاریخ ۴راگست ۲۰۰۲ء۔

۱۴۔روایت: بشیر احمد برلاس‘ مجلہ: اقبالیات‘ لاہور‘ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۰ء‘ ص ۱۵۴۔

۱۵۔نزہت صلاح الدین سے گفتگو بتاریخ ۴/اگست ۲۰۰۲ء۔

۱۶۔انٹرویو پروفیسر محمد منور' از: امجد رؤف + ت ق ش' روزنامہ پاکستان' لاہور' ۱۳/فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۷۔بحوالہ اسناد۔

۱۸۔سید وقار عظیم: سند توصیف۔

۱۹۔صوفی غلام تبسم' سند توصیف' ۲/ستمبر ۱۹۵۲ء۔

۲۰۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' سند توصیف' ۱۸/اگست ۱۹۵۲ء۔

۲۱۔ڈاکٹر سید عبداللہ' سند توصیف' ۲۹/اگست ۱۹۵۲ء۔

۲۲۔انٹرویو پروفیسر محمد منور' از: امجد رؤف + ت ق ش' روزنامہ پاکستان' لاہور' ۱۳/فروری ۲۰۰۰ء۔

۲۳۔انٹرویو پروفیسر محمد منور' از: امجد رؤف خان' سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۴۔

۲۴۔روزنامہ عوام' فیصل آباد' ۲۶/نومبر ۱۹۹۲ء۔

۲۵۔ڈاکٹر محمد صدیق شبلی سے گفتگو' ۲۵/جولائی ۲۰۰۲ء۔

۲۶۔ڈاکٹر محمد صدیق شبلی سے گفتگو' ۲۵/جولائی ۲۰۰۲ء۔

۲۷۔پوشیدہ تری خاک میں' رفیع الدین ہاشمی' ص ۱۶۵۔

۲۸۔انٹرویو پروفیسر محمد منور' از: امجد رؤف خان' سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۷۔

۲۹۔بحوالہ 'میزانِ اقبال' طبع اول' ۱۹۷۲ء۔

۳۰۔بحوالہ 'ایقانِ اقبال' اور 'علامہ اقبال کی فارسی غزل'۔

۳۱۔بحوالہ 'مراسلہ نمبر AR.G.721 F.15-26/79' بتاریخ ۲۱/جولائی ۱۹۷۹ء۔

۳۲۔گورنمنٹ کالج میں چارج لینے کا کاغذ ان کے ذاتی ریکارڈ میں موجود ہے۔

۳۳۔بحوالہ مراسلہ نمبر F.7-6/70-LB-1۔

۳۴۔بحوالہ مراسلہ نمبر F.1-14/84-LB1 بتاریخ ۲۱ر مارچ ۱۹۸۵ء۔

۳۵۔بحوالہ مراسلہ نمبر F-31-69/83-1-A بتاریخ ۲۷ر مارچ ۱۹۸۵ء۔

۳۶۔پروفیسر محمد منور کا ایک خط بتاریخ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۵ء۔

۳۷۔بحوالہ کارروائی ۲۲واں اجلاس مجلس حاکمہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔

۳۸۔خط بنام پروفیسر محمد منور از طرف ملک نسیم احمد آہیر (صدر اقبال اکادمی لاہور) بتاریخ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۶ء۔

۳۹۔قرطاسِ اقبال پروفیسر محمد منور ص ۳۰۲، ۳۰۴۔

۴۰۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو بتاریخ ۲ر اگست ۲۰۰۲ء۔

۴۱۔روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۳ر فروری ۱۹۸۷ء۔

۴۲۔بحوالہ رسید ممبر شپ اقبال اکادمی لاہور۔

۴۳۔رپورٹ از طرف Embassy of Pakistan, The Hague مورخہ ۹ر اگست ۱۹۸۸ء۔

۴۴۔پوشیدہ تری خاک میں، رفیع الدین ہاشمی، ص ۱۶۵۔

۴۵۔پوشیدہ تری خاک میں، رفیع الدین ہاشمی، ص ۱۶۸۔

۴۶۔"""ص ۱۶۵ تا ۱۶۹۔

۴۷۔روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۹ر مئی ۱۹۹۳ء۔

۴۸۔انٹرویو پروفیسر محمد منور از: امجد رؤف خان سیارہ ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۲۱۔

۴۹۔"""

۵۰۔بحوالہ مراسلہ F.1-14/84-LB.1 مورخہ ۲ر اپریل ۱۹۸۹ء۔

۵۱۔بحوالہ مراسلہ F.34-276/89-1A-2443 to 2453 بتاریخ ۸ر

مئی ۱۹۸۹ء۔

۵۲۔بحوالہ ایگزیکٹو کمیٹی' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' کے ۷۵ ویں اجلاس کی کارروائی۔

۵۳۔بحوالہ خط از طرف مقبول وارث ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر۔ بتاریخ کیم جولائی ۱۹۸۹ء۔

۵۴۔بحوالہ مراسلہ F.31-79/83-89-A1' بتاریخ ۲رجولائی ۱۹۸۹ء۔

۵۵۔روزنامہ مشرق' لاہور' ۲۴راگست ۱۹۸۹ء۔

۵۶۔پروفیسر محمد منور کا خط' بنام وزیر اعلیٰ نواز شریف' بتاریخ ۲۵رستمبر ۱۹۸۹ء۔

۵۷۔تحریری سرکلر از طرف سہیل عمر (ڈپٹی ڈائریکٹر اقبال اکادمی' لاہور) F-220/91-232-31/A1' مورخہ ۱۳رمئی ۱۹۹۱ء۔

۵۸۔بحوالہ مراسلہ F-31-232/91-A1' بتاریخ ۱۴رمئی ۱۹۹۱ء۔

۵۹۔پوشیدہ تری خاک میں' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' ص ۹۔

۶۰۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو' بتاریخ ۲راگست ۲۰۰۲ء۔

۶۱۔بحوالہ F-31-69/83-91/Admn' مورخہ ۲۸رجولائی ۱۹۹۲ء۔

۶۲۔بحوالہ مجلس عاملہ کے ۸۵ویں اجلاس کی کارروائی منعقدہ' جون ۱۹۹۶ء۔

۶۳۔خط پروفیسر محمد منور' (بطور سابق ناظم' اقبال اکادمی' پاکستان' لاہور)

۶۴۔یہ نظمیں روزنامہ نوائے وقت' لاہور کے مختلف شماروں مثلاً ۱۹رمئی ۹۳ء' ۲۹رمئی ۹۳ء' ۵رجون ۹۳ء' ۲۴رجون ۹۳ء' ۵رجولائی ۹۳ء' ۱۰رجولائی ۹۳ء' ۱۵رجولائی ۱۹۹۳ء' ۲۱رجولائی ۹۳ء' کیم اگست ۱۹۹۳ء وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۶۵۔بحوالہ D.O.No.1-1/93/Admn' مورخہ ۴رستمبر ۱۹۹۳ء۔

۶۶۔خط پروفیسر محمد منور' بنام ڈاکٹر جاوید اقبال' تاریخ ندارد۔

۶۷۔""""

۶۸۔اس ایوارڈ کے اطلاعاتی خط میں ان کی اقبالیاتی خدمات کا یوں اعتراف کیا گیا تھا: 'مفکر پاکستان' علامہ محمد اقبال کے فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت کے لیے نمایاں خدمات کے اعتراف میں جناب پروفیسر محمد منور صاحب کو ان کی انگریزی کتاب Dimensions of Iqbal پر حکومت کا اعلان کردہ قومی صدارتی ایوارڈ (برائے ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۷ء) دیا گیا۔(یہ خط مرحوم کے نواسے کے پاس محفوظ ہے۔ (

۶۹۔موصولہ خط ۹۷/۱/۱' مورخہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۹۷ء' از طرف حکومت پاکستان۔

۷۰۔بحوالہ سند' ستارۂ امتیاز۔

۷۱۔بحوالہ متعلقہ شیلڈ' ۱۹۹۲ء شمسی۔

۷۲۔قومی ڈائجسٹ' لاہور' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۴۔

۷۳۔بحوالہ رپورٹ IHT/19/A/ESTB' بتاریخ ۱۴ر جولائی' ۱۹۹۹ء۔

۷۴۔قومی ڈائجسٹ' لاہور' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۵ء۔

۷۵۔"""ص ۹۴۔

۷۶۔"""ص ۹۶۔

۷۷۔"""ص ۵۷۔

۷۸۔"""ص ۵۷۔

۷۹۔"""ص ۵۷۔

۸۰۔"""ص ۹۶۔

۸۱۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء۔

۸۲۔آئندہ سطور میں درج' تعزیتی بیانات اور جعفر بلوچ کے اشعار نوائے وقت'

لاہور کے ۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔

۸۳۔روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور' ۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء۔

۸۴۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء۔

۸۵۔علامہ محمد اقبال' بال جبریل' ص ۱۷۔

۸۶۔دیوارِ برہمن' پروفیسر محمد منور' ص ۱۰۔

۸۷۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۸۸۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۴۳۔

۸۹۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۴۴۔

۹۰۔اس نکتے کی تفصیل پروفیسر محمد منور کے مجموعہ مضامین پاکستان۔حصارِ اسلام (گوہر سنز' لاہور [۱۹۹۸ء]) میں دیکھی جا سکتی ہے۔جس میں ایک جگہ انھوں نے قائداعظم کے ایک جملے کا حوالہ دیا ہے اور وہ یہ ہے Pakistan is the fortress of Islam (ص ۱۹۴)

۹۱۔زیرِ طبع کتاب کا ایک باب۔

۹۲۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۴' ۹۵۔

۹۳۔ڈاکٹر وحید عشرت سے گفتگو' ۱۸ر جولائی ۲۰۰۲ء۔

۹۴۔پوشیدہ تری خاک میں' رفیع الدین ہاشمی' ص ۱۱۳' ۱۳۵' اور ۱۳۸۔

۹۵۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۱۹' نیز ڈاکٹر محمد صدیق شبلی سے گفتگو' ۲۵ر جولائی ۲۰۰۲ء۔

۹۶۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰' ص ۱۵۶۔

۹۷۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۷۔

۹۸۔فلیپ دیوارِ برہمن' پروفیسر محمد منور۔

۹۹۔زیرِ طبع کتاب کا ایک باب۔

۱۰۰۔ڈاکٹر ظہور احمد اظہر' زیرِ طبع کتاب کا ایک باب۔

۱۰۱۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۷۔

۱۰۲۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵؍ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۰۳۔" "

۱۰۴۔انٹرویو پروفیسر محمد منور' از: امجد روف خاں سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۳۴
۔

۱۰۵۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی' ۲۰۰۲ء۔

۱۰۶۔مشاہدہ حق کی گفتگو' پروفیسر محمد منور' ص ۵۴۔

۱۰۷۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۰۸۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۷ مارچ ۲۰۰۰ء۔

۱۰۹۔دیباچہ دیوار برہمن' پروفیسر محمد منور' ص ۷۔

۱۱۰۔" " ص ۶۔

۱۱۱۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۷۔

۱۱۲۔طارق مجید' سابق ائر کموڈور' روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۸ فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۱۳۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۱۴۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۱۵۔سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۲۳۔

۱۱۶۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۱۷۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۵۸' ۵۹۔

۱۱۸۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۸ فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۱۹۔" ۷فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۲۰۔" ۸فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۲۱۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۶۲۔

۱۲۲۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۷فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۲۳۔مجلّہ' اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۵۵۔

۱۲۴۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۹۷۔

۱۲۵۔یہ تقریب فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ہوئی تھی۔اس میں نسیم حجازی مرحوم' نعیم صدیقی مرحوم' خرم مراد مرحوم' سراج منیر مرحوم' قاضی حسین احمد اور میجر ریاض حسین بھی بطور مقرر شامل تھے۔مرزا صاحب نے اپنی تقریر میں افسوس ظاہر کیا کہ مشرقی پاکستان میں دفاع پاکستان کا فریضہ مسلم لیگ کو انجام دینا تھا' مگر یہ سعادت مولانا مودودیؒ کے بیٹوں کے حصے میں آئی' حالانکہ مولانا پر ''غداری'' کا الزام لگایا جاتا رہا ہے___ماخوذ: 'پروفیسر محمد منور: البدر اور جمعیت' (ایک قلمی یادداشت) از پروفیسر سلیم منصور خالد۔(اس کی نقل راقمہ کے پاس محفوظ ہے)

۱۲۶۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر' ۲۰۰۰ء' ص ۱۱۶۔

۱۲۷۔کبیر احمد مظہر' قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۸۰۔

۱۲۸۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۵۶۔

۱۲۹۔محمد یوسف عرفان' قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۶۹۔

۱۳۰۔عنبرین صلاح الدین' "" ص ۷۹۔

۱۳۱۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو' ۲راگست ۲۰۰۲ء۔

۱۳۲۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۳۳۔امجد اسلام امجد' روزنامہ جنگ' لاہور' ۲۰فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۳۴۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی' اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۱۶۔

۱۳۵۔مجلّہ اقبالیات' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء' ص ۱۱۷۔

۱۳۶۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۸۰۔

۱۳۷۔پوشیدہ تری خاک میں' رفیع الدین ہاشمی' ص ۵۲۔

۱۳۸۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۸۰۔

۱۳۹۔سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۳۴' ۳۵۔

۱۴۰۔پروفیسر محمد منور' قرطاسِ اقبال' ص ۳۰۷۔

۱۴۱۔پروفیسر محمد منور' ایقانِ اقبال' ص ۲۔

۱۴۲۔پروفیسر محمد منور' علامہ اقبال کی فارسی غزل' ص ۲۵۔

۱۴۳۔خواجہ عابد نظامی' روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۷ مارچ ۲۰۰۰ء۔

۱۴۴۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۱۱ فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۴۵۔امجد اسلام امجد' روزنامہ جنگ' لاہور' ۲۰ فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۴۶۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۵۶' ۵۷۔

۱۴۷۔پروفیسر محمد مظفر مرزا' زیر طبع کتاب کا ایک باب۔

۱۴۸۔قومی ڈائجسٹ' مارچ ۲۰۰۰ء' ص ۶۵۔

۱۴۹۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(خیال رہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے نام کے ساتھ 'مرزا' کا سابقہ لکھنا چھوڑ دیا تھا' چنانچہ ان کی کسی تصنیف پر ان کے نام کے ساتھ مرزا کا لفظ موجود نہیں' مگر ان کی عرفیت 'مرزا صاحب' ہی تھی۔)

۱۵۰۔روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۱۱ فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۵۱۔طارق مجید (سابق ایئر کموڈور) روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۸ فروری ۲۰۰۱ء۔

۱۵۲۔قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۸۱۔

۱۵۳۔"" ص ۵۷۔

۱۵۴۔پروفیسر محمد سلیم،قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۵۹۔

۱۵۵۔"" ص ۵۷۔

۱۵۶۔قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۷۶۔

۱۵۷۔بحوالہ ACR رپورٹ۔

۱۵۸۔قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۷۸۔

۱۵۹۔"" ص ۷۲۔

۱۶۰۔بشیر حسین برلاس،مجلّہ اقبالیات،جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء،ص ۱۵۲۔

۱۶۱۔قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۹۴۔

۱۶۲۔قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۵۶۔

۱۶۳۔بشیر حسین برلاس،مجلّہ اقبالیات،جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء،ص ۱۵۵۔

۱۶۴۔نزہت صلاح الدین،قومی ڈائجسٹ،مارچ ۲۰۰۰ء،ص ۹۷۔

۱۶۵۔مجلّہ اقبالیات،جولائی۔ستمبر،۲۰۰۰ء،ص ۱۱۵۔

۱۶۶۔روزنامہ نوائے وقت،لاہور،۱۱فروری ۲۰۰۰ء۔

۱۶۷۔میرزا ادیب،روزنامہ نوائے وقت،لاہور،۲۳۔نومبر ۱۹۸۹ء۔

باب نمبر۲

اقبال اور فکرِ اقبال سے وابستگی

تعلیم' افراد میں انسانیت کا شعور پیدا کرتی ہے اور مقاصدِ عالیہ کی طرف ان کی راہنمائی بھی کرتی ہے' اگر انسان ان مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو کرے تو اس کی کاوشوں کی ایک سمت متعین ہو جاتی ہے۔ پروفیسر محمد منور صاحب نے بھی اپنے فکر و نظر کی ایک خاص سمت متعین کر لی تھی' اور ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اس خاص مقصد کی تبلیغ' اس نظریے کی اشاعت اور اس نصب العین کی خدمت ہی میں گزرتا رہا۔ یہ خاص مقصد اور نصب العین حضرتِ علامہ کے افکار و نظریات کی تبلیغ و تشریح کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ان کی تعلیمی' تحریری' تقریری و انتظامی اور فکری سرگرمیاں اسی کے لیے وقف تھیں۔ (خیال رہے کہ پروفیسر منور صاحب' اقبال کا ذکر ہمیشہ ''حضرتِ علامہ'' کہہ کر کیا کرتے تھے۔)

علامہ اقبال اور فکرِ اقبال سے غایت درجہ وابستگی کے پسِ پردہ کون سے عوامل کارفرما تھے؟ اور مرزا محمد منور نے شعوری طور پر اقبالیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا کیسے بنا لیا؟ یہی اس باب کا موضوع ہے۔

مرزا محمد منور کے والد مرزا ہاشم الدین بھی علامہ اقبال کے مداح تھے۔ وہ عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے۔ مرزا ہاشم الدین کے ایک دوست تھے: عبدالرحمٰن۔ وہ مرزا غالب کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ مرزا منور کا بیان ہے کہ اکثر ہمارے گھر میں دو گروہ بن جاتے۔ ایک گروہ غالب کی شاعرانہ عظمت منوانے کے لیے دلائل دیتا' جبکہ دوسرا گروہ حضرتِ علامہ کی فکری و نظریاتی اہمیت پر زور دیتا۔ اس زمانے میں علامہ اقبال حیات تھے اور ان کی 'شکوہ' 'جوابِ شکوہ' 'شمع اور شاعر' اور 'خضرِ راہ' جیسی نظموں نے

پورے ہندستان میں دھوم مچادی تھی۔ بلا مبالغہ علامہ اقبال اس وقت عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اس دور کے ایک اہم قومی اور ملی شاعر تھے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میرے کان میں پہلی سیاسی اذان مولانا ظفر علی خاں نے دی۔ ۱ اسی طرح ذہن کے ابتدائی نقوش کی تیاری میں حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بچپن ہی میں ان کے بہت سے اشعار یاد ہو چکے تھے۔ وہ تیسری جماعت میں تھے تو انھیں بانگِ درا کی نظم پرندے کی فریاد بہت پسند تھی۔ بالخصوص اس نظم کا یہ مصرع: 'میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے'۔۲ ایک بار کھیتوں میں سیر کرنے کے لیے گئے' ہاتھ میں پالتو بٹیر پکڑ رکھی تھی۔ جب بٹیر نے ان کی مٹھی میں سے گردن نکال کر چہچہانا شروع کیا' تو انھیں اچانک علامہ اقبال کا متذکرہ بالا مصرع یاد آ گیا اور انھوں نے بٹیر کو آزاد کر دیا۔ اسے علامہ اقبال سے مرزا محمد منور کے فکری و روحانی تعلق کا پہلا اہم واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔۳

آٹھویں جماعت تک پہنچے تو دیوان غالب آدھے سے زیادہ یاد ہو چکا تھا اور بانگِ درا کا خاصا حصہ بھی انھوں نے یاد کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے شعری ذوق کی تسکین کی خاطر مولانا ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری بلکہ فردوسی' حافظ اور سعدی کے اشعار بھی پڑھنا اور انھیں یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ظفر علی خاں اور حفیظ کے انداز میں مشقِ سخن بھی شروع کر دی تھی۔۴ اس شعری روایت کی تربیت میں وہ مولانا ظفر علی خاں کو اپنا روحانی استاد کہتے ہیں۔۵

فرمایا کرتے: میری شاعری پر تین بڑے شاعروں کے اثرات تھے' اقبال' ظفر علی خاں اور غالب۔۶

اگرچہ اس دور میں انھیں کلام اقبال کا خاصا حصہ یاد ہو چکا تھا' لیکن بالِ جبریل کا

کچھ حصہ سمجھنا دسویں جماعت کے طالب علم کے لیے مشکل تھا۔ بطور شاعر مرزا غالب کو پسند کرتے تھے لیکن زندگی کے بارے میں عقائد و نظریات کے لحاظ سے انھیں غالب اپنے سے دور اور اقبال بہت قریب محسوس ہوتے تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں:

زندگی میں میرے جو عقائد تھے وہاں علامہ کے سوا کوئی اور فٹ نہیں ہوتا تھا۔ جس شخص کا اسلامی تہذیب و تاریخ سے ہمیشہ رابطہ رہا ہو ظاہر ہے کہ اس کے لیے اقبال کی شخصیت ہی ایک مرکز کے طور پر سامنے آئے گی۔ ۷

یہ ذکر آ چکا ہے کہ مرزا محمد منور اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے مسلسل کاوش کرتے رہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے مرزا صاحب عربی جاننا ضروری سمجھتے تھے۔ لہٰذا آپ نے ۱۹۵۳ء میں ایم اے عربی اور پھر خاصے وقفے سے ۱۹۶۷ء میں ایم اے فلسفے کا امتحان پاس کیا۔ جب لائل پور کالج میں ان کا تقرر ہوا تو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ان کا اقبالی ذوق بھی پروان چڑھنے لگا۔ اس سے قبل لائل پور میں یومِ اقبال کے حوالے سے جلسے ہوا کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے باقاعدہ ایک "مجلس اقبال" قائم کی۔ آپ ہی کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں بھی اس مجلس کے مرکز و محور اور روحِ رواں آپ ہی تھے۔ ہر سال ۲۱ اپریل کو مجلس اقبال کے زیر اہتمام ایک بڑی تقریب منعقد کی جاتی۔ خاص اور سالانہ اجلاس میں لاہور سے ڈاکٹر سید عبداللہ، نذیر نیازی اور بعض دیگر ادبی مشاہیر بھی تشریف لاتے تھے۔ عمومی اجلاس میں بالعموم حاضری ۱۵ سے ۲۰ تک ہوتی تھی۔ پاکستان، تاریخ اسلام اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بالعموم ایک دو مضامین پڑھے جاتے تھے اور پھر ان پر فکرِ اقبال کے حوالے سے مجلس میں عام بحث و تنقید کی جاتی۔ ۸ مجلس اقبال کے اجلاس میں مرزا محمد منور متحرک رہتے۔ اس طرح اقبال کے ساتھ آپ کی

وابستگی میں اضافہ ہوتا گیا۔آپ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں:

تیسری جماعت سے علامہ صاحب کے ساتھ میرا شغف شروع ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھتا چلا گیا اور جب میں فیصل آباد پہنچا تو میرا اقبالی ہونا ایک معروف قسم کا امر بن چکا تھا۔اسی وجہ سے دوستوں نے مجلس اقبال کا بانی صدر بنا دیا۔میرا کوئی قصور نہیں ...... یہ میرا ذوقی اور عشقی مسئلہ ہے۔۹

اقبال کے حوالے سے مرزا محمد منور کی پہچان کا آغاز اسی مجلس اقبال سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مجلس اقبال کے تحت یومِ اقبال کی بڑی تقریب منعقد ہوئی۔جسٹس ایم آر کیانی اس کے مرکزی صدر مقرر تھے۔ان کی کشش سے چنیوٹ' ملالیہ اور سرگودھا ہر طرف سے وکلا کثیر تعداد میں آ گئے۔لائل پور کے ڈسٹرکٹ ہال میں جلسہ منعقد ہوا جس کی حاضری معمول سے خاصی زیادہ تھی ۔کرامت حسین جعفری صدارت کر رہے تھے۔کیانی صاحب جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ صاحبو! اس جلسے میں جہاں جہاں صدر کو مخاطب کیا ہے' اس سے مراد مجلس اقبال کے اصل صدر (مرزا منور) ہیں' اس محفل کے عارضی صدر نہیں۔ اب کرامت حسین جعفری صاحب کی پوزیشن بڑی عجیب ہوگئی' کیونکہ کیانی صاحب جب صدر کو مخاطب کرتے' مرزا صاحب کی طرف دیکھتے۔اسی تقریر میں جسٹس کیانی نے یہ شعر پڑھا:

ترے دم سے ہے بزمِ اقبال قائم
محمد منور محمد منور

اگلے دن جب کیانی صاحب کی تقریر اخبارات میں چھپی تو ہر طرف اسی شعر کا چرچا ہونے لگا۔۱۰

وہ جتنا عرصہ فیصل آباد میں مقیم رہے' مجلس اقبال کی یہ رونق اسی طرح قائم رہی' آپ

کے شاگردِ رشید ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی راوی ہیں کہ دورانِ تدریس بھی آپ کسی نہ کسی طرح اقبال کو لے ہی آتے تھے۔۱۱

۱۹۶۱ء میں راجا حسن اختر نے آپ کو مرکزیہ مجلس اقبال سے متعارف کروایا۔ جو اقبال کے افکار وخیالات کی تشریح وتوضیح کا ایک قدیم ادارہ تھا۔ آپ اس میں مجلس کے رکن کے طور پر شریک ہوتے رہے۔ یومِ اقبال کے جلسوں میں تقاریر کرنے لگے' یہ آپ کے ذوق کی تسکین کا بڑا موثر اور بہترین پلیٹ فارم تھا۔ مرکزیہ مجلس اقبال ہی میں آغا شورش کاشمیری نے آپ کو 'سفیرِ اقبال' کا خطاب دیا۔۱۲

اقبالیات سے آپ کی وابستگی کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے ۵ سال تک پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات میں بطور چیئر مین خدمات انجام دیں۔ آپ نے اقبال کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں ہونے والی پہلی اقبال عالمی کانفرنس (۱۹۷۷ء) کے اردو' انگریزی اور عربی مقالات کی تدوین وترتیب کا کام کیا۔ علاوہ ازیں آپ کی نگرانی میں محمد آفتاب احمد نے ''اردو شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھا۔۱۳

پروفیسر محمد منور کی ان تمام کاوشوں کے پیچھے ہمیں ایک ایسے شخص کا دل و دماغ کام کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو ہر طریقے سے خود بھی علامہ اقبال کے افکار کا اسیر ہے اور نسلِ نو کو بھی اس فکر سے آشنا کرانا چاہتا ہے۔ پروفیسر منور کا خیال' بلکہ پختہ یقین تھا کہ جو شخص اقبال' قائداعظم اور پاکستان سے خلوص اور وفاداری برتے گا' وہ زندگی میں کامیاب ہوگا اور جو ان تینوں سے غداری برتے گا' وہ ناکام رہے گا' بلکہ دنیا میں بھی اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔۱۴

فروغِ اقبالیات کے سلسلے میں آپ مختلف کالجوں اور اداروں میں تقاریر کیا کرتے تھے۔ آپ نے بیرونِ ممالک متعدد مرتبہ سفر بھی کیے۔ سب سے پہلا اقبالی سفر مصر کا

تھا۔ اس زمانے میں وہاں راجا ظفر الحق سفیر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یہاں آپ نے پہلی مرتبہ عربی میں فی البدیہہ تقریر کی۔۱۵ آپ کا دوسرا اقبالی سفر شام کا تھا۔ یہاں آپ نے دمشق' حلب' لاطاکیہ اور حمص وغیرہ میں یومِ اقبال کے حوالے سے تقاریر کیں اور خرابیِ صحت کے باوجود بڑی ہمت سے طے شدہ پروگرام کو نبھایا۔ دورانِ سفر جب بیمار ہوئے تو اس حوالے سے لکھتے ہیں: میں نے اپنی 'خودی' کو للکارا کہ دیکھیے میں یہاں قومی وملی ڈیوٹی پر آیا ہوں' میری وجہ سے اگر پروگرام کی ایک ننھی سی شق بھی منسوخ ہوئی تو یہ شرمندگی کی بات ہوگی۔۱۶

اقبال کے افکار ونظریات کا فروغ آپ کا مشن تھا۔ یہاں آپ جس مشن پر آئے تھے' اس حوالے سے اقبال سے لگاؤ رکھنے اور جوانوں سے بات کرنے کا موقع ملا' انھیں اقبال کے تصورِ اخوت کا درس دیا اور کہا کہ اقبال نے امت کے مستقبل کے لیے جو جو پیش گوئیاں کی تھیں' وہ آج درست ثابت ہو رہی ہیں' اور جو ابھی تک پردۂ تقدیر میں ہیں وہ آیندہ جلوہ گر ہوں گی۔ یہ آپ کے خالص اقبال کے سفیر ہونے کا ثبوت ہے۔۱۷

مصر اور شام کے علاوہ آپ ایران' سپین' ناروے' بنگلہ دیش اور دبئی بھی گئے۔ عربی میں گفتگو کر لیتے تھے' ایران میں فارسی بولنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں بھارت میں منعقدہ عالمی اقبال سیمی نار میں مدعو تھے۔ مگر آپ نے ایک دشمن ملک میں جانا پسند نہیں کیا۔۱۸

اقبالیات سے مرزا صاحب کی وابستگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ پاکستان میں اقبالیات کے سب سے بڑے ادارے اقبال اکادمی کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اقبال اکادمی کی نظامت کے زمانے میں آپ کو اقبال کے کلام اور فکر کی اشاعت کا ایک نسبتاً وسیع میدان ہاتھ آیا۔ اس زمانے میں آپ نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح

سے اکادمی کے اشاعتی منصوبوں کو تیزی سے مکمل کیا جائے اور اقبالی مطبوعات کو وسیع پیمانے پر شائع کیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔ ہر سال ۹ نومبر اور ۲۱ اپریل کو مزارِ اقبال پر اور مرکزیہ کے جلسوں میں کتابوں کے سٹال لگائے جاتے جہاں کتابیں نصف قیمت پر فروخت کی جاتیں' اس طرح فروختِ کتب میں خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹ آپ اقبال اکادمی کی مالی گرانٹ میں اضافے کے لیے بھی کوشاں رہے۔ ایک بار آپ نے اس وقت کے وزیر اعظم جناب نواز شریف سے گزارش کر کے دو لاکھ روپے کی سالانہ گرانٹ کا اضافہ کروایا۔ اس کے علاوہ بھی اپنے دوست احباب سے مالی تعاون کی گزارش کرتے رہتے تا کہ فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ آپ نے خود بھی اپنی تنخواہ اکادمی کو دینا شروع کر دی تا کہ اس کی مالی مشکلات کم کی جا سکیں۔ ۲۰ اسی طرح آپ نے اپنی سات کتب کی رائلٹی اقبال اکادمی کو ہبہ کر دی۔ ۲۱ اقبال اکادمی اردو مجلّہ اقبالیات اور انگریزی رسالہ Iqbal Review تو شائع کر رہی تھی' اب فارسی' عربی اور ترکی رسالے بھی جاری کیے گئے۔ فارسی اور عربی کے متعدد شمارے شائع ہوئے۔ ۲۲

آپ ہی کے دور میں ایرانی خاتون سکالر ڈاکٹر شہین دخت مقدم صفیاری' اقبال اکادمی سے وابستہ ہو گئیں۔ وہ یہاں فارسی کے حوالے سے اقبال پر تحقیقی و علمی نوعیت کے کام کرتی رہیں۔ ایک تو انھوں نے زندہ رود کا فارسی ترجمہ کیا' پھر مرزا صاحب کی علامہ اقبال کی فارسی غزل کو بھی فارسی زبان میں منتقل کیا' اسی طرح ایقانِ اقبال اور میزانِ اقبال کو بھی۔

پروفیسر محمد منور صاحب کا عزم یہ تھا کہ انڈونیشیا اور ملائیشیا کی زبانوں میں بھی اقبال پر کام کروایا جائے۔ اس سلسلے میں آپ طرح طرح کے منصوبے بناتے۔ ایک مرتبہ

ایک صاحب جو وسطِ ایشیا کی کسی ریاست میں سفیر بن کر تعینات ہوئے تھے' مرزا صاحب سے اکادمی میں ملنے کے لیے آئے' تو اس موقع پر بھی مرزا صاحب کی گفتگو کا موضوع یہی تھا کہ وسطِ ایشیا میں اقبال کو کس انداز سے اور کس طرح سے متعارف کروایا جائے اور اس کے لیے کیا کاوش کی جائے۔۲۳ اسی سلسلے میں اکادمی نے کلیاتِ اقبال اردو کو سیریلک رسم الخط میں شائع کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے اقبال کے فارسی کلام کا اردو نثر میں ترجمہ کرانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اکادمی کے علمی رفیق، احمد جاوید صاحب کا تیار کردہ پیام مشرق کا اردو ترجمہ شائع بھی ہو گیا ہے۔ ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ ایوانِ اقبال میں علامہ اقبال کی شاعری کے تراجم کے سلسلے میں متعدد ممالک کی زبانوں میں الگ الگ شعبے قائم کیے جائیں۔۲۴

آپ فکرِ اقبال کے بے لاگ شارح تھے۔ اقبال سے آپ کی وابستگی ایسی گہری تھی کہ آپ نے اس سلسلے میں کبھی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا۔ آپ کے خیال میں اقبال کا پیغام موروثی نہیں' نظری و فکری ہے' جس کو فکرِ اقبال کی سمجھ ہے' وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کی وضاحت کرے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال گو کہ علامہ اقبال کے فرزند تھے' لیکن اگر وہ بھی کوئی ایسی ویسی بات کر جاتے تو مرزا صاحب کہتے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال' علامہ اقبال کی رائلٹی کے وارث ہیں' رائے کے نہیں۔ رائے کا وارث میں ہوں۔ جس ادب و ثقافت کے مالک اقبال تھے' ڈاکٹر جاوید اقبال کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۲۵ اسی طرح ایک مرتبہ معروف کشمیری مجاہد سردار عبدالقیوم نے ناروے میں اقبال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نامناسب انداز میں کیا۔ اس پر مرزا صاحب بھی خاموش نہ رہ سکے۔۲۶ اور انھوں نے ایک مختصر سی نظم کہہ ڈالی۔ جو اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔ نظم یہ ہے:

تھا ناروے میں آپ کا ارشاد نا روا
با حرف و صوت دیکھ لی تصویر آپ کی
ہم گوش اہلِ اوسلو کے ہم بھی ہوگئے!
وڈیو کے فیض سے سنی تقریر آپ کی
کس جرم کے حساب میں یوں جلوہ گر ہوئی
تقریر کے لباس میں تعزیر آپ کی
اک عاشقِ رسولؐ کی توہین برملا
سردار جی! الٹ گئی تقدیر آپ کی ۲۷

آپ کے نزدیک تدریسی، تحریری، تقریری اور جملہ شخصی پہلوؤں سے اقبال سے وابستگی، زندگی میں ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ آپ کے خیال میں اقبال، اسلام کے نقیب ہیں۔ ایک مرتبہ مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا: قائداعظم اس قوم کے لیے خضرِ سالک اور اقبال خضرِ مجذوب تھے۔۲۸

مرزا صاحب نے فکرِ اقبال سے وابستگی کو ہمیشہ اپنی خوش بختی خیال کیا۔ انھوں نے اقبال کو ایک نقاد یا محقق کے طور پر کبھی نہیں پرکھا۔ آپ کے ذہن میں اقبال کا جو تاثر قائم تھا وہ اتنا صاف، واضح اور نمایاں تھا کہ آپ نے کبھی بھی کلامِ اقبال، اور فکرِ اقبال کو چھانٹنے، پھٹکنے کے قابل نہیں سمجھا۔ آپ ایک عاشق، ایک عقیدت مند اور ایک مرید کے طور پر ہی اقبال سے وابستہ رہے۔ خود فرماتے ہیں:

میں نے تو اس سلسلے میں تحقیق بہت کم کی ہے، کیونکہ یہ میرا ذوقی اور عشقی مسئلہ ہے۔ لیکن یہ کہ علامہ کے نام کے ساتھ میرا نام بطور برخوردار اور نیازمند کے اس طرح نتھی ہوگیا ہے کہ اس شعبے میں کوئی کمال نہ دکھانے کے باوجود یہ عزت ملی ہے۔۲۹

فکرِ اقبال سے آپ کی وابستگی کی جھلکیاں خود ان کی شخصیت میں نظر آتی ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گزشتہ باب میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ کے نظریات کی اٹھان اور بعض شخصی خوبیاں اقبال سے مماثلت رکھتی ہیں۔ خواجہ عابد نظامی کہتے ہیں کہ درد کی وجہ سے آپ جب قدرے لنگڑا کر چلنے لگے تو کہا کرتے تھے کہ خدا کا شکر ہے مجھے حضرت علامہ کے دونوں ہی امراض مرحمت ہوئے ہیں یعنی ضیق النفس اور شیاٹیکا۔۳۰ اقبال سے آپ کی وابستگی اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے علامہ اقبال کو کبھی بھی اقبال نہیں کہا ہمیشہ حضرتِ علامہ یا علامہ اقبال کہا کرتے۔۳۱ اقبال سے اپنی گہری قلبی و ذہنی وابستگی کے پیشِ نظر ہی آپ فکرِ اقبال کو مزید آگے بڑھانے کا عزم بھی رکھتے تھے' تاکہ مسلمانوں کے مستقبل کو مزید بہتر اور بامعنی بنایا جا سکے۔ آپ کے خیال میں اقبال نے جس علمی تحقیق کی طرف متوجہ کیا تھا' ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ اقبال اکادمی کو آپ پورا ایک اسلامی سیکرٹریٹ بنانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ:

> باقاعدہ ایک فقہی سیکرٹریٹ ہونا چاہیے' جس میں چیدہ چیدہ فقہائے کرام اکٹھے بیٹھیں اور اس پر غور کریں ...... یہ اسلامی سیکرٹریٹ افکارِ اقبال اور اسلام کے علمی خزانوں کا خزینہ ہو' جس کا حکومتوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔۳۲

الغرض اقبال سے وابستگی آپ کے ہاں ایک عارضی' وقتی یا جذباتی بات نہ تھی' اقبال کے افکار کی اشاعت آپ کی زندگی کا مرکز و محور تھا۔ فکرِ اقبال کی اشاعت یا اقبال پر تحقیقِ مزید بھی محض علمی قابلیت کو بڑھانے کی بات نہ تھی اور نہ یہ کوئی اکیڈمک مسئلہ تھا' یہ تو ان کے نزدیک ایک عقیدے کی بقا و استحکام اور ایک نظریے یا آئیڈیالوجی کی ترویج کا معاملہ تھا۔ اقبالیات کے فروغ کے لیے ان کا تحریری اور علمی سرمایہ اقبالیات سے ان کی وابستگی کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے۔ ان کی اقبالی تصانیف و

تالیفات میں اردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے علاوہ، بہت سے مضامین و مقالات بھی شامل ہیں۔

آیندہ ابواب میں اس تحریری سرمائے کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

حوالے اور حواشی

۱۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱ فروری ۲۰۰۰ء۔

۲۔ علامہ اقبال، بانگ درا، ص ۳۸۔

۳۔ ہفت روزہ ندا، ۱۹/اپریل ۱۹۸۸ء۔

۴۔ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۵۔

۵۔ پروفیسر محمد منور، انٹرویو از: عمران نقوی، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۵ نومبر ۱۹۹۲ء

۔

۶۔ پروفیسر محمد منور، انٹرویو از: عمران نقوی، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۵ نومبر ۱۹۹۲ء

۔

۷۔ """"

۸۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو، ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۹۔ سیارہ ڈائجسٹ، دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۔

۱۰۔ """

۱۱۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو، ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۱۲۔ """

۱۳۔ مجلہ تحقیق، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، جلد ۱۳، شمارہ ۱ تا ۴، ۱۹۹۱ء، ص ۹۹۔

۱۴۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو' ۲/ اگست ۲۰۰۲ء۔

۱۵۔پروفیسر محمد منور'قرطاس اقبال'ص ۳۰۷۔

۱۶۔"" ص ۳۱۸۔

۱۷۔""ص ۳۲۷'۳۲۸۔

۱۸۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو' ۲۔اگست ۲۰۰۲ء۔

۱۹۔سیارہ ڈائجسٹ'دسمبر ۱۹۹۰ء۔

۲۰۔بحوالہ خط F-31-69/83-91/Admn 'مورخہ ۲۸/ جولائی ۱۹۹۲ء۔

۲۱۔پروفیسر محمد منور'خط بنام اقبال اکادمی'مورخہ ۳/ جولائی ۱۹۸۹ء۔

۲۲۔اشاریہ مجلّہ اقبالیات'مرتبہ:اختر النساء۔

۲۳۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو' ۲/ اگست ۲۰۰۲ء۔

۲۴۔روزنامہ جنگ'لاہور' ۹/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

۲۵۔ خطاب بہ موقع پاکستان رائٹرز گلڈ' پنجاب' روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۲۲/ اپریل ۱۹۸۷ء۔

۲۶۔اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے اقبالیات کے تین سال'ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی'ص ۸۸ تا ۹۴۔

۲۷۔۲۱/ دسمبر ۱۹۸۷ء کی تحریر۔

۲۸۔روزنامہ نوائے وقت'لاہور' ۲۲/ اپریل ۱۹۷۸ء۔

۲۹۔سیارہ ڈائجسٹ'دسمبر ۱۹۹۰ء'ص ۲۰۔

۳۰۔روزنامہ نوائے وقت'لاہور' ۷/ مارچ ۲۰۰۰ء۔

۳۱۔ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے گفتگو' ۲۵/ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۳۲۔ہفت روزہ ندا' ۱۹/ اپریل ۱۹۸۸ء۔

باب نمبر۳

پروفیسر محمد منور کا اقبالیاتی سرمایہ

(اردو)

علامہ اقبال کے فکر وفن کو سمجھنے اور ان کی شاعری اور افکار پر تنقید و تحسین کا آغاز‘ علامہ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اقبالیات‘ ایک موضوع کی حیثیت سے خاصی وسعت اختیار کر چکا ہے۔ ہمارے نقاد اور محقق حضرات نے اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا‘ اور اس کے متعدد گوشے منور کیے ہیں۔ ان میں سے چند اصحاب نے تو اقبالیات کو اپنا خاص موضوع بنایا اور فکرِ اقبال کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش میں عمر صرف کر دی‘ مگر اقبال کی شاعری اور نثر ایسی ہمہ پہلو اور بھر پور ہے کہ اس کے شرح وتفسیر کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ دورِ حاضر میں اقبال کے شرحِ افکار کی افادیت یوں بھی دوچند ہو جاتی ہے‘ کہ اقبال ایک نظریاتی مفکر تھے۔ انھوں نے پیش آمدہ مسائل کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا۔ اور ان پر غور وخوض کر کے ان کے حل کے لیے ہمیں سوچ اور عمل کا راستہ دکھا دیا تھا۔

پروفیسر محمد منور ایک ایسے عالم‘ مصنف اور نقاد ہیں جنھوں نے فکرِ اقبال کے عملی پہلو کو اہمیت دی۔ انھوں نے بڑی محنت وکاوش سے اقبال کے نظریات و افکار کو اقبال کے قارئین اور شائقین کے لیے عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ اقبال کی شاعری اور فکر کے دقیق نکات کو بڑے سہل انداز اور موثر پیرائے میں اجاگر کیا ہے اور پھر اقبال کے پیغام کو دورِ حاضر کے مسائل سے یوں مربوط کیا ہے کہ اقبال آج بھی ہمیں اپنے درمیان موجود نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ اقبال ایک عظیم شاعر تھے‘ مگر ان کی فکر کو قابلِ عمل حیثیت سے پیش کرنا پروفیسر محمد منور کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ایک علمی اور ملی

ذمہ داری تھی، جسے انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے نبھایا۔ ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اقبالیات کا ایک طالب علم ہی سمجھا۔۱

آپ کے خیال میں:

اقبال کے افکار کو عام کرنا، روحِ اسلام اور معانیِ قرآن کو عام کرنا ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی میں جس قدر حضرت علامہ کے افکار نے امت کے دلوں کو ڈھارس بندھائی، اس قدر بہت کم افراد امت سے ممکن ہو سکا۔ امت کا یہ دور اقبال مندی ہے۔۲

آپ نے اقبال کی تفہیم و شرح کے سلسلے میں اوائل ہی سے مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ تقاریر کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ متذکرہ مضامین مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ بعد ازاں انھیں کتابی صورت میں مرتب و مدوّن کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں اب تک پروفیسر محمد منور کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ میزانِ اقبال طبع اول ۱۹۷۲ء۔

۲۔ ایقانِ اقبال "۱۹۷۷ء۔

۳۔ علامہ اقبال کی فارسی غزل "۱۹۷۷ء۔

۴۔ برہانِ اقبال "۱۹۸۲ء۔

۵۔ قرطاسِ اقبال "۱۹۹۸ء۔

انگریزی میں انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ چار مجموعوں کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ ان کا تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا۔

ذیل میں متذکرہ بالا اردو کتب کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

میزانِ اقبال

اقبالیات پر پروفیسر محمد منور کا یہ پہلا مجموعہ مضامین ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۸ مضامین شامل ہیں۔ آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ ان مضامین کے پس منظر پر مصنف نے دیباچے میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اقبال پر لکھنے کا محرک کیا تھا؟ لکھتے ہیں:

میں نے تو یہ دیکھا کہ سیکڑوں اہلِ علم اور اربابِ نظر ایک سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سوچا کہ میں کیوں محروم ہوں اور بقدرِ استطاعت کچھ نہ کچھ میں بھی کیوں نہ حاصل کرلوں۔ (ص ۱۷)

کتاب میں شامل چھ مقالات اس سے قبل مختلف جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں یہ مقالات کلامِ اقبال کے ادبی پہلو سے متعلق ہیں۔ آپ نے حرفِ آغاز میں علامہ اقبال کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے افکار و نظریات ایک طرف تو الہامی نوعیت کے ہیں' دوسری طرف انھوں نے عقل سے بھی روشنی حاصل کی ہے۔ پروفیسر محمد منور، اقبال کی نظم 'التجائے مسافر' کے دعائیہ شعر کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کی اسی دعا نے انھیں ایک عام شاعر سے خالص نظریاتی شاعر بنا دیا ہے۔ اقبال کے دل میں جو خلوص اور درد تھا' وہی ان کو ممتاز کرتا ہے۔

کتاب کا انتساب راجا حسن اختر کے نام ہے۔ راجا صاحب' محمد منور کے بزرگ دوستوں میں سے تھے۔ آپ سے ان کا شخصی تعلق لائل پور کے زمانے سے اس وقت قائم ہوا' جب وہ یومِ اقبال کے ایک جلسے میں پروفیسر محمد منور کا مقالہ سن کر اس قدر

متاثر ہوئے کہ ان سے ملنے ان کے گھر چلے آئے۔ بعد ازاں پروفیسر محمد منور' راجا صاحب ہی کی وساطت سے مرکزیہ مجلس اقبال میں شامل ہوئے' اور پھر ان کی وفات تک پرخلوص تعلقات استوار رہے۔

میزانِ اقبال کا مقدمہ معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر کیا ہے۔ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں اور نہ آپ کے تبحر علمی میں کلام ہے۔ آپ ایک مسلمہ اقبال شناس اور عالم تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ: 'ان مضامین کے مطالعے سے اقبالیات کے سلسلے میں میری معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔' (ص ۲) اقبالیات میں پروفیسر محمد منور کے عالمانہ مقام کا اعتراف ہے' اور خراجِ تحسین بھی۔ اس مقدمے میں جناب سید عبداللہ نے ایقانِ اقبال کے ہر مضمون کا جستہ جستہ جائزہ لیا ہے۔ سید صاحب نے تمام مضامین کو ادبی اعتبار سے نئی تحقیق قرار دیا ہے۔ البتہ ایک مضمون 'اقبال جوش کی نظر میں' انھیں پسند نہیں آیا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

اس مجموعے میں ایک مضمون ایسا بھی ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ مضمون نگار بڑی نیک نیتی سے خود ہی اپنے مقصد کو نقصان پہنچا گیا ہے۔ (ص ۸)

اس کی وجہ یہ ہے کہ سید عبداللہ صاحب کی نظر میں شاعری میں جوش کا ایک مقام ہے' مگر ناقد کے طور پر ان کا مرتبہ مشکوک ہی نہیں' معدوم ہے۔ (ص ۹)

اس کے باوجود آپ قائل ہیں کہ پروفیسر محمد منور نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے' ان میں ایک نیا زاویۂ نظر پایا جاتا ہے۔ سید صاحب آخر میں ان الفاظ میں اس کتاب کی تحسین و تعریف کرتے ہیں:

مدت کے بعد ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں جن میں علم کی روشنی ہے۔ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے اور انھیں پڑھ کر مجھے بہت سی نئی باتیں سوجھی ہیں۔ (ص ۱۰)

میزانِ اقبال کا فارسی ترجمہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ذیل میں مضامین کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

❑ کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات

اقبال کو سرزمینِ عرب سے گہری محبت تھی' کیونکہ یہ رسول اکرم ا کا وطن تھا۔ چنانچہ عربی زبان و ادب سے شغف و شیفتگی پیدا ہو جانا تعجب کی بات نہیں۔ یہ عنصر اقبال قلب و ذہن کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ (ص ۲۱)

علامہ اقبال سرزمین عرب کو براہِ راست نہ دیکھ سکے۔ صرف دوسری گول میز کانفرنس سے لوٹتے ہوئے وہ قاہرہ اور بیت المقدس میں چند روز کے لیے رکے تھے۔ البتہ اقبال نے عربی ادب کی روح کو جس طرح تصاویر کی شکل دی تھی' اور جو مرقع نگاری کی وہ سرزمینِ عرب سے ان کی قلبی وابستگی اور اس بارے میں ان کے مطالعے کے ذریعے سے ممکن تھی۔ وہ ایسی تشبیہات' استعارات اور تلمیحات استعمال کرتے ہیں کہ ذہن فوراً عربی ماحول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر محمد منور نے عربی زبان و ادب میں ایم اے کی سند حاصل کی تھی' پھر ذاتی مطالعے اور محنت سے اتنی دسترس حاصل کر لی کہ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ (گذشتہ صفحات میں ان کی عربی دانی کا ذکر آ چکا ہے) انھوں نے کلامِ اقبال کی اس نئی جہت کا مطالعہ بہت دقتِ نظر سے کیا ہے' اور اس طویل مقالے میں ان کے ایسے اشعار کی نشان دہی کی ہے' جن میں اقبال عربی ادب سے متاثر ہوئے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں اقبال کے ہاں بانگِ درا کے پہلے دو حصوں میں عربی اور اسلامی اثرات کم کم ہیں' مگر یورپ سے لوٹے تو اندازِ فکر بدل چکا تھا۔ اس کے بعد اسرارِ خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک میں عربیت کے اثرات نمایاں نظر آتے

ہیں ۔عمر کے ساتھ ساتھ ان کی دینی شیفتگی بھی بڑھتی چلی گئی ۔اس تناسب سے کارواں' قافلہ' زمام' ناقہ' سبیل' منزل' طناب' نخل وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال بھی تدریجاً بڑھتا چلا گیا۔(ص ۲۷)

پروفیسر محمد منور کے خیال میں عربی شعروادب سے اقبال کی یہ اثر پذیری بالکل فطری امر ہے۔کیونکہ جس ادب کا بھی مطالعہ کیا جائے' دل و دماغ کا' اس کے کچھ نہ کچھ اثرات قبول کرنا ایک فطری بات ہے ۔ (ص ۳۶) اپنی اس بات کی دلیل میں انھوں نے وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جن پر عربی ادب کے گہرے اثرات ہیں اور عرب شعرا نے بھی ان سے ملتے جلتے اشعار کہے ہیں۔

اپنے اس مقالے میں پروفیسر محمد منور نے قارئین کو یہ نکتہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے اقبال کے اطراف میں بھی بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ورنہ کلامِ اقبال کی تفہیم میں دقت پیش آتی ہے۔میرزا ادیب اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کلامِ اقبال پرعربی ادب کے اثرات' غالباً اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے ۔وہ اس موضوع پر قادر ہیں کہ عربی ان کا مضمون ہے اوراس زبان میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔[۳۲]

کلامِ اقبال میں عجم کا مفہوم

عربی زبان میں "اعجم" اور "عجم" دونوں کلمات غیر عرب باشندوں کے لیے مستعمل تھے۔ زیرِ نظر مضمون میں پروفیسر محمد منور صاحب نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ: علامہ اقبال کے یہاں عجم ملک کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجاز مرسل کے طور پر مراد اس سے بھی قومِ عجم ہے۔ (ص ۴۴) حضرتِ علامہ کا شعر ہے:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی! ۴

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے۵

یہاں 'عجم' سے جملہ غیر عرب اقوام مراد ہیں۔

پھر وہ بتاتے ہیں کہ اقبال کے یہاں عجم ایران کے لیے بھی آتا ہے' اور غیر عرب کے لیے بھی۔ (ص ۴۵) اس کے بعد انھوں نے کچھ مثالیں بھی دی ہیں' اور پھر یہ غور طلب نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ کیا علامہ اقبال کے کلام میں کلمۂ عجم محض ایک واضح جغرافیائی حیثیت کے ساتھ ہی وارد ہوتا ہے' یا اس کی کوئی اصطلاحی اور علامتی حیثیت بھی ہے؟ (ص ۴۶) وہ کہتے ہیں کہ: عجم اور تعجم ایک مزاج کا نام ہے جس میں تکلف' تصنع' نکتہ' گہرائی' موشگافی' اختراع' سجاوٹ وغیرہ کے عناصر شامل ہیں۔ یہ کیفیت ہر شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے نثر' نظم' رقص' تعمیر' عقیدہ' لباس' ظروف اور رہن سہن کے دیگر آداب۔

عجمیت سے غیر واضح' پُر تکلف اور پُر تصنع رجحانات پروان چڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

کہ:

> علامہ اقبال کے نزدیک عجمیت یہ ہے کہ نظر کمال غایت کے بجائے حسنِ وسائل پر رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غایت غائب ہوجاتی ہے۔ مآل حسنِ خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ زندگی کی ٹھوس حقیقت' کھوکھلی نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ (ص ۴۷)

پروفیسر محمد منور نے مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے کہ علامہ کے نزدیک عرب اپنے خیالات کی ندرت' مشاہدات اور تقویٰ و روح کی کیفیات کی وجہ سے پسندیدہ ہے۔ جبکہ عجم اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کے باعث ناپسند ہے اور وہ تمدن' تصوف' شریعت' کلام کو عجمی اثرات سے اس لیے بچانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی نگاہ الجھ کر رہ جاتی ہے اور یہ سب یقین کے ضعف کا علاج کرنے سے قاصر ہیں۔ اقبال اسی وجہ سے اہلِ اسلام کو عرب کی طرف لوٹانے کے متمنی ہیں کہ وہاں ہی زندگی کی اصل ہے۔

مگر عرب کو محض عرب ہونے پر بھی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ عرب سے مراد دراصل وہ مزاج ہے جو اسلام سے ہم آہنگ ہے۔ اور اقبال نے جگہ جگہ اسی وجہ سے عرب کو پسند کیا ہے اور یہی منشا حضورِ اکرمؐ کا بھی تھا کہ کسی عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر فضیلت صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔ علاقے کی نسبت کسی کو برتر یا کمتر کرنے کا موجب نہیں بن سکتی۔ اقبال کے سارے فلسفے کا مغز دراصل یہی نکتہ ہے۔

❑ توازن۔ اقبال کی شاعری کا ایک اہم پہلو

اس مضمون میں پروفیسر محمد منور صاحب نے علامہ اقبال کے افکار و اشعار کے ایک اہم پہلو' توازن' پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال ہر نظامِ فکر اور فلسفے کی اچھی چیزوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور بری چیزوں پر بھی۔ (ص ۵۹) اور وہ ان افکار و نظریات میں توازن پیدا کرتے ہیں، مثلاً جمہوریت کے قائل بھی ہیں' اور

اشتراکیت کی بھی اچھی باتوں کی تعریف کرتے ہیں، مگر ان کی خدا ناشناس اور احترامِ روحِ انسانیت سے عدمِ آگاہی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ خودی، پھر بے خودی اور شکوہ پھر جواب شکوہ میں مثبت و منفی دونوں پہلو موجود ہیں۔ اقبال نے مسولینی کی تعریف بھی کی ہے اور پھر اس سارے تمدن پر بھی لعن طعن کی، جس نے یورپ کی استعماری اور فسطائی روح کو جنم دیا تھا۔

پروفیسر محمد منور کے خیال میں اقبال کی متوازن فکر کو جانچنے کے لیے اقبال کے 'مردِ مومن' کو دیکھنا چاہیے، جو ایک نہایت متوازن کردار ہے:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں ٦

'مسجد قرطبہ' کے اس شعر:

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

کے حوالے سے پروفیسر محمد منور، اقبال کے پیش کردہ اس متوازن کردار پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

علامہ اقبال کا نصب العینی انسان 'احسن تقویم' کی صحیح مثال ہے۔ سختی کی جگہ سختی، نرمی کے موقع پر نرمی، جگرِ لالہ کے لیے ٹھنڈک، دریاؤں کے لیے طوفان، کوہ و بیابان کے لیے سیلِ تندرو اور گلستان کے لیے جوئے نغمہ خواں، بزمِ اُنس میں ابریشم، رزمِ حق و باطل میں فولاد یہی اسلام کی اصل روح ہے، اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔ (ص ۷۱)

وہ کہتے ہیں کہ اسی طرح اقبال کے ہاں مشرق و مغرب کا تصور اور عقل و دل کا تصور اقبال کے متوازن ہونے کی دلیل ہے۔ آپ خالص رہبانیت اور خودغرض مادہ پرستی، دونوں سے ناخوش ہیں۔

پروفیسر محمد منور بعض ناقدین اقبال کی غیر متوازن آرا پر تبصرہ کرتے ہیں:

ان بزرگوں کی تعریض بے محل ہے جو کہتے ہیں کہ اقبال ''لٹھ لے کر'' عقل کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی آرا غیر معتدل ہیں اور اقبال کی تعلیمات وتصریحات کو تماماً پیشِ نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں۔ اقبال دل کو یا عشق کو عقل پر ترجیح ضرور دیتے ہیں، مگر یہ ترجیح کی بات ہے، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے نظامِ فکر میں عقل کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ (ص ۷۶، ۷۷)

پروفیسر صاحب کے نزدیک اقبال کے تصورِ خودی کو 'تصورِ قوت' قرار دینا اور اس کا سلیس ترجمہ 'فاشیست' کرنا 'بذاتِ خود غیر متوازن ہونے کی علامت ہے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں: اقبال جس قوت کے حامی ہیں وہ 'پابند حدود' ہے۔ وہ شرع کے تابع ہے' اس کی روح اعتدال ہے۔ (ص ۷۷، ۷۸) آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

علامہ اقبال کے اسما جو قوت پر دلالت کرتے ہیں' وہ محض علامات ہیں' ورنہ قوت کا اصل سرچشمہ 'پابندی' خود اپنی ذات میں ایک قوت ہے اور روحاً اور معناً چنگیزیت اور فاشیت اور فسطائیت سے بالکل مختلف ہے۔ (ص ۷۹، ۸۰)

❑ علامہ اقبال کی اردو غزل

یہ طویل مضمون ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے' جس میں اقبال کی اردو غزل کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد منور اس بات پر قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اقبال جنھیں آگے چل کر حالی اور اکبر الہ آبادی کی صف میں شامل ہونا تھا' ابتدا میں داغ کی پیروی کرتے رہے؟ بہر حال آگے چل کر ان کا مزاج بالکل ہی مختلف ہو جاتا ہے۔ یعنی:

عشق　دمِ　جبریل'　عشق　دلِ　مصطفیٰ
عشق　خدا　کا　رسول'　عشق　خدا　کا　کلام ۸

دراصل غزل گوئی کے باب میں اقبال کے ہاں واضح طور پر ایک ارتقا نظر آتا ہے پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ پروفیسر محمد منور کے خیال میں پہلے دور کی غزلوں سے ان کے پہلے دور کی نظمیں زیادہ کامیاب ہیں۔(ص ۸۳)دوسرے دور (۱۹۰۵ء۔۱۹۰۸ء) میں اقبال کی غزل میں ارتقا زیادہ نمایاں ہے۔اس میں یورپ کی مشینی زندگی سے بیزاری'مغربی تہذیب سے ناخوشی'نظریۂ ملت'وغیرہ جیسے مضامین شامل ہیں۔ تیسرے دور (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۳ء) میں انھوں نے کامیاب نظمیں کہی ہیں۔بلکہ بقول پروفیسر محمد منور:'علامہ کی غزل میں پُرتغزل نظموں کا جوہر مزید بڑھ گیا۔'(ص ۸۶) گویا اقبال نے نظم اور غزل کے درمیانی فاصلے کو کم کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔پھر بھی تیسرے دور کی غزلیں ان کے کمالِ فن کا اظہار کرتی ہیں۔(ص ۸۷)

بالِ جبریل کی غزلیات معنوی اور لفظی ہم آہنگی دکھاتی ہیں۔ان غزلیات کا لغوی دامن بہت وسیع ہے۔اس کی وجہ اقبال کا وسیع مطالعہ ہے۔پروفیسر صاحب نے بالِ جبریل کی غزلوں کا فنی موازنہ بھی کیا ہے۔

اقبال کی غزلیات کے بارے میں یہ کہنا کہ چونکہ یہ فلسفیانہ مضامین کی حامل ہیں'اس لیے ان کو غزل سے خارج کر دینا چاہیے'بالکل ایک نامناسب بات ہے۔کیونکہ اردو کے بعض دوسرے شعرا نے بھی غزل میں اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین بیان کیے ہیں۔

آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اقبال نے غزل کو جو نیا رنگ دیا'اس کی اہمیت و افادیت'اظہر من الشمس ہے۔اقبال نے اردو غزل کو بہت سی باتوں سے نجات دلائی اور بدلے میں نئی تراکیب اور نئے علائم و رموز سے اردو غزل کی جھولی بھر دی۔ (ص ۹۸)

یہ مضمون اقبال کی اردو غزل پر ایک جامع تبصرہ ہے اور موضوع کے جملہ پہلوؤں کا

احاطہ کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کی نظم نگاری

اس مقالے میں اقبال کی تمام متداول نظموں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔کلام اقبال کے مطالعے اور اس کے اثرات پر بحث سے پہلے پروفیسر منور یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اقبال کو مفکر، فلسفی یا دانائے راز کہنا تو ٹھیک ہے، مگر ان کے کلام کو محض شعروشاعری کے روایتی معیارات پر پرکھنا ناانصافی ہے۔

پروفیسر صاحب کے خیال میں اقبال کے افکار و احساسات کی تازگی و توانائی نے اردو شاعری کی وسعت و ترقی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے، خصوصاً اردو نظم، غزل اور قطعہ کے اصناف کو کلامِ اقبال نے بہت متاثر کیا ہے۔(ص ۱۰۰) علاوہ ازیں شاعری کے ذریعے پیغام، ترسیل اور اظہارِ فکر و فلسفہ کی روایت بھی اردو شاعری میں منتقل ہوئی۔

اس کے بعد مصنف نے اردو شاعری کی اس روایت کا مختصراً جائزہ لیا ہے، جس کا آغاز دکن سے ہوا تھا۔روایتی شاعری میں اقبال کی کاوش اور ان کا مقام کیا ہے؟ اس سلسلے میں منور صاحب نے مجنوں گورکھپوری کے قول کا حوالہ دیا ہے، کہ اگر اقبال نہ ہوتے تو حالی اور آزاد کی کوششوں کے باوصف اردو شاعری کو بلندی تک پہنچنے میں کافی وقت درکار ہوتا۔(ص ۱۰۲)

وہ کہتے ہیں کہ اقبال نے اس ضمن میں ایک اور کام انجام دیا اور وہ یہ کہ آپ نے اردو شاعری میں انگریزی کے افکارِ جدیدہ بھی سموئے۔اقبال پر انگریزی شاعری کا بہر حال اثر موجود تھا۔اس سلسلے میں اقبال کی نظم 'ہمالہ' اہم ہے۔اس کے لیے پروفیسر صاحب نے اختر اورینوی اور مجنوں گورکھپوری کے حوالے بھی دیے ہیں۔

اقبال کی نظموں میں قابلِ توجہ چیز ان کی داخلی کیفیت ہے۔ وہ اشیا کو جس طرح محسوس کرتے ہیں، اپنے شعروں میں ان داخلی محسوسات کو الفاظ کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔ بلکہ پروفیسر محمد منور کے الفاظ میں ''شیلے اور کیٹس کی طرح اقبال یوں ڈوب جاتے ہیں کہ عنوان یا موضوع کا خارجی وجود تقریباً تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔'' (ص ۱۰۷)

اس طرح اقبال کی منظومات لطافت بیان اور ایک خاص طرح کے آہنگ سے بھی لبریز ہیں۔ ان کا کلام سرتاسر فصیح ہے۔ پروفیسر صاحب کلامِ اقبال پر کلام کرتے ہوئے کہیں کہیں ان کے ہم عصر شعرا کے کلام پر بھی نظر ڈالتے ہیں، کہ بعض اچھے معیار کے شاعر بھی ''بغایت پست'' کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مومن، میر تقی میر اور مولانا صفی لکھنوی کی شاعری سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ''بغایت بلند'' کے معیار کو برقرار رکھنا اقبال ہی کے بس کی بات تھی۔ ممکن ہے وہ اس کی شعوری کوشش بھی کرتے ہوں۔ ان کا یہ شعور آخر تک ارتقا پذیر رہا۔ (ص ۱۱۲) یہاں پروفیسر محمد منور نے اقبال کا ایک شعر درج کیا ہے جو ان کے اس احساس کا ترجمان ہے کہ ترقی کا سفر برابر جاری رہنا چاہیے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں ؁

اقبال کی بعض نظموں میں تغزل کا رنگ خوب چمک اٹھا ہے۔ بلکہ 'تصویرِ درد'، 'خضرِ راہ' اور 'طلوعِ اسلام' کے کئی کئی بند علامہ اقبال کے رنگ کی پر کیف تصویریں ہیں۔ (ص ۱۱۳) اسی وجہ سے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو نظموں کے اشعار ہونے کے باوصف، ہو بہو غزل کا سا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں۔ (ص ۱۱۴)

کلامِ اقبال کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد منور نے ایک اور بات کہی ہے وہ لکھتے

ہیں:

علامہ اقبال کی ابتدائی نظمیں اور غزلیں دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تغزل کا بیشتر حصہ نظموں کی نذر ہو گیا۔ اس لیے کہ ابتدائی نظمیں' ابتدائی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ دلکش ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کی نظمیں تغزل کے اعتبار سے اقبال کی غزلوں سے کسی دور میں فرومایہ نہیں رہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ (ص ۱۱۵)

ایک اور قابلِ توجہ عنصر نیم ڈرامائی عنصر ہے۔ جس کا آغاز حالی نے کیا اور اقبال نے اس کو آگے بڑھایا۔ البتہ اقبال نے نظم معریٰ کا تجربہ نہیں کیا۔

اقبال کی اردو نظموں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو الفاظ کے ذخیرے میں جو اضافہ کیا ہے' وہ زیادہ تر فارسی اور عربی تراکیب سے اخذ شدہ ہیں۔ پروفیسر محمد منور نے اپنے تجزیے کے بعد اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اقبال کے موضوعات اور اسلوب کا تقاضا تھا کہ وہ فارسی' عربی کی تراکیب وضع کر کے انھیں اختیار کرتے۔ ورنہ وہ بھی لکیر کے فقیر رہتے ہوئے سابق شعرا ہی کی روش کو اپنائے رکھتے۔

یوں یہ مضمون اقبال کی اردو منظومات کا ایک عمدہ اجمالی جائزہ ہے' جس میں دیگر ناقدین کی آرا کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

❑ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی کی نظر میں

اس مضمون میں پروفیسر محمد منور علامہ اقبال کے وکیل بن کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے بارے میں جوش ملیح آبادی کی ہرزہ سرائی کا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسی جواب سے خود جوش ملیح آبادی کا "مقام و مرتبہ" بھی متعین ہو جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے روزنامہ جنگ (۱۹۶۳ء) میں یہ لکھا:

جب ہندوستان کے رہنماؤں کے سروں پر ڈنڈے برس رہے تھے‘ اور ان کو جیل کی کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جا رہا تھا‘ اس وقت ہم (شعرائے اردو) اپنی غداری کے صلے میں انگریز کی سرکار سے ”خان بہادر“ اور ”سر“ کے خطاب پا رہے تھے.....

جوش کے اس بیان سے پروفیسر محمد منور نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شعرائے اردو میں ”سر“ کا خطاب پانے والے تو علامہ اقبال تھے۔ رہے خان بہادر شعرا‘ تو ان میں سب سے زیادہ نامور اکبر الہ آبادی اور حفیظ جالندھری ہیں۔ ان کے بعد شاد عظیم آبادی مرحوم۔ شاد سے انھیں کوئی پرخاش نہیں کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ گویا جوش کا اصل ہدف علامہ اقبال اور حفیظ ہیں۔ (ص ۱۲۲‘ ۱۲۳)

پروفیسر محمد منور نے پہلے تو وضاحت کی ہے کہ اقبال نے بہت اصرار کے بعد سر کا خطاب قبول کیا‘ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ خطاب پانے کے باوجود اقبال نہ تو اسلام دوستی سے ہٹے‘ اور نہ ان کے افکار و نظریات میں کوئی فرق آیا۔ اس وضاحت کے بعد پروفیسر محمد منور نے جوش صاحب کے ان خیالات کا پوسٹ مارٹم کیا ہے‘ جو انھوں نے مختلف مواقع پر اقبال کے بارے میں ظاہر فرمائے۔ مثلاً جوش نے اپنی کتاب حرف و حکایت میں اقبال کے جذبۂ حب الوطنی کو نشانۂ تنقید بنایا ہے اور پھر اپنی کتاب اشارات میں کہتے ہیں کہ اقبال اصل میں تو معمولی جوہر کے مالک تھے‘ محض صوبائی تعصب کی وجہ سے ان کو یہ بلند مقام ملا۔ (ص ۱۴۰) یا پھر جوش نے اقبال کے تصورِ عشق‘ کو بالکل منفی اور سفلی معنوں میں لے کر اس تصور کا مذاق اڑایا ہے اور خود اپنا تصورِ عقل و عشق پیش کیا ہے، جو محمد منور کے خیال میں سراسر مختلف ہے اور اقبال کے تصورِ عقل و عشق سے نہایت فرومایہ ہے۔ جوش نے اقبال کے مصرع:

آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد[۱۰]

کا حوالہ دے کر آزادیِ افکار کی حمایت میں نعرہ لگایا تھا۔ یہاں منور صاحب نے

وضاحت کی ہے کہ جو قوم بے نظم و بے آئین ہو چکی ہو وہاں روشن خیالی' ایک آفت ہے۔ معاشرے میں خیالات کی تنظیم لازم ہے۔ ورنہ افکارِ جدیدہ آزمایش ہیں اور انحطاط کی طرف لے جانے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے بہت سے دیگر اشعار بھی اس خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کے خیال میں جوش ان ترقی پسندوں میں سے ہیں جو اقبال کا مذاق اڑانا اپنا جماعتی فریضہ سمجھتے ہیں۔ (ص ۱۴۶) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت اور سربلندی جوش صاحب کے لیے ایک مستقل دردِ جگر ہے۔ اور وہ اس کرب کا اظہار رنگ بدل بدل کر کرتے ہیں۔ (ص ۱۳۹) اقبال نے ایک آزاد اسلامی سلطنت کا تصور پیش کیا' جبکہ جوش نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ (ص ۱۲۹) پروفیسر محمد منور کے اس مضمون کا حاصل ان ہی کے الفاظ میں:

فرق نظریاتی ہے۔ علامہ اقبال ہندی قوم اور اسلامی ملت کے چشم و چراغ ہیں اور جوش ہندی قوم اور اشترا کی ملت کے نورِ نظر۔ (ص ۱۳۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جوش صاحب' حضرت علامہ کے بارے میں جو کچھ فرماتے ہیں' فرمایا کریں' ان کے کہنے سے علامہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ شاعری میں ان کا ایک مقام ہے مگر ناقد کے طور پر ان کا مرتبہ مشکوک ہی نہیں' معدوم ہے۔ بہر صورت' استدلال کی حد تک پروفیسر منور نے جو کچھ لکھا ہے' اچھا لکھا ہے اور میرے خیال میں فائدے سے خالی نہیں۔ (ص ۹)

❑ حفیظ جالندھری بحضورِ اقبال

ابو الاثر حفیظ جالندھری اور اقبال کی باہمی ملاقاتوں کا حال' اس مضمون کا موضوع

ہے۔ پروفیسر محمد منور نے ابتدا میں حفیظ جالندھری کی شاعری پر بات کی ہے'بعد ازاں حفیظ اور اقبال کے مابین ہونے والی گفتگو کو ایک مضمون کی صورت میں بیان کیا ہے۔

اس مضمون کی اہمیت اس لیے دوچند ہو جاتی ہے کہ پروفیسر محمد منور جب بھی حفیظ جالندھری سے کہتے کہ آپ علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا احوال بیان فرمائیں تو وہ ہمیشہ ٹال جاتے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پروفیسر محمد منور' حفیظ جالندھری کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ پروفیسر صاحب نے بتایا ہے کہ حفیظ سے انٹرویو لینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ آخر جناب شورش کاشمیری کے کہنے پر حفیظ صاحب آمادہ ہو گئے۔ پھر گفتگو شروع ہوئی۔ پروفیسر صاحب سوال کرتے جاتے اور وہ جواب دیتے جاتے۔ (ص۱۶۰'۱۶۱)

اقبال سے پہلی ملاقات' ان کی منظومات سے دلچسپی' وغیرہ کا ذکر واقعاتی صورت میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے اقبال اور حفیظ کی شخصیت اور فن کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں تحریر میں آ گئی ہیں' جو شائقین اقبال کے لیے دلچسپ' معلومات افزا اور اقبالیات میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔ مثلاً حفیظ بتاتے ہیں کہ منٹو پارک میں ہونے والے مشاعرے میں جب جوش نے ملحدانہ قسم کے اشعار پڑھے تو اگلے روز اقبال نے حفیظ کو بلوایا۔ اور سرزنش کی کہ تمھاری غیر موجودگی سے کیا نقصان ہوا؟ اور کہا کہ ان کا تعاقب کرو۔ (ص۱۷۴'۱۷۵)

اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ شاہنامہ اسلام لکھنے کا ارادہ ظاہر کرنے پر اقبال نے حفیظ کی حوصلہ افزائی نہیں کی' لیکن حفیظ نے اس کے باوجود شاہنامہ لکھا اور جب اس کی پہلی جلد اقبال کے سامنے پیش کی تو انھوں نے حفیظ سے کہا: حج پر جاتے ہوئے اس کو ساتھ لے جاؤ اور حضور کی خدمت میں پیش کرنا' اسی طرح ایک بار خصوصی طور

پر بلوا کر اس کے مختلف حصے سنے۔

الغرض یہ مضمون ایک طرف تو اقبال اور ابوالاثر کے ذہنی رابطوں اور ملاقاتوں کا احوال بیان کرتا ہے' دوسری طرف حفیظ اور پروفیسر محمد منور کی باہمی قربت' قلبی تعلق اور شیفتگی کا اظہار بھی ہے۔

❑ علامہ اقبال کا شعری آہنگ اور ضربِ کلیم

ضربِ کلیم بڑی ہی سنجیدہ مزاج کتاب ہے۔ (ص ۱۹۰) پروفیسر صاحب نے اس مضمون میں یہ دیکھا ہے کہ اگرچہ اقبال نے اس کتاب میں مختلف فکری اور سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے' مگر یہ اشعار شعریت کے جوہر سے خالی نہیں ہیں۔ (ص ۲۰۰) پورے مضمون میں پروفیسر محمد منور نے ضربِ کلیم کی اس خوبی اور خاصیت کو متعدد شعری مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

پروفیسر محمد منور کے خیال میں علامہ کا ذہنی و فکری جہان، اس خاکی جہان اور گرد و پیش کے ماحول سے مختلف تھا' جس میں انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک طویل سفر طے کیا اور محنت و کاوش سے ایک نیا جہان آباد کیا۔ اس میں آخر دم تک کوئی نقص واقع نہ ہوا۔

وہ کہتے ہیں کہ ضربِ کلیم میں اقبال نے کھل کر اپنے مقاصد و اہداف پر کلام کیا ہے۔ وہ عصرِ حاضر کی کن چیزوں سے بیزار تھے؟ اور کس کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ بعض امور پر وہ پہلے بھی اظہارِ خیال کر چکے تھے۔ مگر اب:

اب وہ ہدف کو متعین کر کے' اسے عنوان بنا کے' چبھتے ہوئے انداز میں بات کہنا چاہتے تھے...... یہ تحدیدی رویہ بڑی سنجیدگی کا متقاضی تھا..... اس کے باوصف حضرت علامہ کی شاعرانہ فنکاری اپنا جادو جگانے سے باز نہیں آئی۔ (ص ۱۹۰)

اس کے بعد پروفیسر محمد منور نے ضربِ کلیم کی شاعری کے فنی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ اقبال نے فن پر فن کارانہ تنقید کی ہے‘انھوں نے شاعری پر شاعرانہ طرز میں گرفت فرمائی ہے۔ان کا طعنہ اوران کی توبیخ بھی رعنائی کی حامل ہے ۔ان کی تلقین خشک وعظ نہیں ۔(ص ۲۰۰)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بعض نقادوں نے جوضربِ کلیم کی شاعری کوفنی طور پر بالِ جبریل کے مقابلے میں کمتر قرار دیا‘اور یہ کہا کہ ضربِ کلیم میں اقبال تھکے تھکے نظر آ رہے ہیں (اور پروفیسر محمد منور نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے‘ ص ۱۸۸ طبع دوم)___ یہ مضمون‘ غالباً اسی کا ردِعمل ہے۔بہر حال‘پروفیسر محمد منور نے بڑی خوبی کے ساتھ‘ضربِ کلیم کے فنی مقام ومرتبے اوراس کے شعری آہنگ پر کلام کیا ہے۔

میزان اقبال: مجموعی جائزہ

کتاب کے زیادہ تر مقالے کلامِ اقبال کے فنی وادبی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں ۔البتہ دو مقالات (’کلام اقبال میں عجم کا مفہوم‘اور’توازن: اقبال کی شاعری کا ایک پہلو‘)اقبال کے فکری رجحانات کی توضیح میں لکھے گئے ہیں ۔

کتاب کا پہلا مضمون’کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات‘نسبتاً نیا پہلو ہے۔کتاب کے شائع ہونے تک اس موضوع پر سوائے ایک مضمون کے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ (ص ۲)

یہ عالمانہ مقالہ پروفیسر محمد منور کے فکری وعلمی کمال کی عکاسی کرتا ہے۔مگر ازراہ انکسار کہتے ہیں کہ’میں اقبالیات کا محض طالب علم ہوں،ادنٰی اور مبتدی، اس لیے اقبال فہمی کا دعویٰ بڑی بات ہوگی ۔افہام کی منزل دور ہے‘ پھر ’’تنقید‘‘___ ایک دور تر مرحلہ ہے۔(ص ۱۶)

ان مضامین میں تحقیقی رنگ غالب ہے۔ مختلف عرب دانوں کے اقوال' قرآنِ حکیم کی آیات اور مغربی مفکرین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اقبال کی ادبی و فنی خصوصیت کے حوالے میں اقبال کے فارسی اور اردو اشعار درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس حوالے سے کہتے ہیں:

ان موضوعات میں ایک نیا زاویۂ نظر پایا جاتا ہے ..... اس لحاظ سے یہ سب مقالات نئے ہیں' بالکل نئے..... یہ نہ لکھے جاتے تو مطالعہ اقبال نا تمام و نامکمل ہی رہتا۔ جناب منور نے ان موضوعات پر لکھ کر بعض خلا پورے کر دیے ہیں۔ اور اس سے فہمِ اقبال کے راستے کشادہ ہوتے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان مضامین کے مطالعے سے اقبالیات کے سلسلے میں میری معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ (ص ۲)

ایک اور پہلو جو ان مضامین کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ محمد منور صاحب نے کلامِ اقبال کے ان ادبی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے جن کی طرف سے ہمارے ناقدوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ یہ بھی بتایا ہے کہ اس فن کے پیچھے اقبال کی فکری راست روی اور فطری خصائص بھی بہت اہم ہیں۔ اقبال چونکہ خود متوازن تھے لہٰذا ان کے کلام میں بھی توازن کی خصوصیت اجاگر ہے۔ کہتے ہیں ان کا فنکارانہ مزاج شعر میں ناہمواری' شاذ ہی برداشت کرتا ہے۔ (ص ۱۰۹) اس طرح سے اقبال کی شخصیت میں عجمیت اور مغربیت کی بجائے عربیت اور مشرقیت کی روح موجود تھی۔ اور آپ نطقِ عرب کے حامی تھے۔ (ص ۵۰) اسی بنیادی نظریے پر مصنف نے اپنے دو مقالے سپردِ قلم کیے ہیں جس میں اگرچہ بظاہر کلام اقبال کے فنی و ادبی محاسن پر گفتگو کی گئی ہے' مگر دراصل اقبال کی فکر کا ایک اسلوب سمجھایا گیا ہے۔ بالکل یہی کیفیت آخری مقالے بعنوان 'علامہ اقبال کا شعری آہنگ اور ضربِ کلیم'

کے حصے میں بھی موجود ہے۔میرزا ادیب کہتے ہیں:

میزانِ اقبال میں سات مضامین ہیں۔اور یہ سب کے سب اپنے مخصوص موضوعات کے اعتبار سے بصیرت افروز بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔!!

☆☆☆

ایقانِ اقبال

پروفیسر محمد منور کی زیر نظر دوسری کتاب جنوری ۱۹۷۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ۔دوسری بار اسے اقبال اکادمی پاکستان نے شائع کیا۔

میزانِ اقبال کے زیادہ تر مضامین علامہ کے شعری فن سے متعلق تھے ۔اس کتاب کا موضوع علامہ اقبال کے نظریات کی تفہیم وتشریح ہے ۔موضوعات نئے ہیں البتہ پروفیسر صاحب نے اپنی اس کوشش کو بڑے عجز وانکسار کے ساتھ پیش کیا ہے' لکھتے ہیں:

حضرت اقبال کے بعض نظریات کو سمجھنے کی یہ نا کام کوشش آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں 'من آنم کہ من دانم' موضوعات بڑے اہم ہیں ۔ان تک صحیح معنوں میں میرے ذہن کو رسائی حاصل نہیں ۔لہٰذا اہل علم و دانش دیکھ لیں کہ مجھ سے کیا کیا کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں ۔(ص ۲)

کتاب میں ۷ مضامین شامل ہیں ۔ضمیمے میں 'قرآن کریم میں ملت کا مفہوم' کے عنوان سے ایک مختصر ۴ صفحاتی مضمون بھی شامل ہے ۔آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے ۔کتاب کا انتساب پروفیسر کرامت حسین جعفری کے نام ہے' جو ایک نامور ماہر تعلیم تھے ۔اور پروفیسر محمد منور کے قیام لائل پور میں وہاں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہے ۔

ایقانِ اقبال کا پیش لفظ نامور قانون دان اور ادیب و شاعر جسٹس ایس اے رحمان کے قلم سے ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے انقلابی پیغام کو سمجھنے کے لیے ایسے عالم باعمل کی ضرورت ہے' جو اقبال کے فکر و احساس کے سوتوں کا بھی شعور رکھتا ہو ۔شارحِ اقبال کے تعین کے لیے اگر اس معیار کو دیکھا جائے تو آپ کے خیال میں

پروفیسر محمد منور ہر لحاظ سے اقبال کے مفسر اور شارح ہونے کے اہل ہیں۔(ص ۷)

زیرِ نظر کتاب کے تمام تر موضوعات فکرِ اقبال کے بنیادی اور مرکزی موضوعات ہیں ۔اس تمہیدی گفتگو میں ایس اے رحمان کے مطابق موضوعات کا انتخاب غماز ہے کہ پروفیسر محمد منور کی علمی دلچسپیاں کس نوعیت کی ہیں ۔اندازِ تحریر صاف شفاف ہے ۔(ص ۷)اس کتاب کا فارسی ترجمہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب میں شامل مقالات کا تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

❑ علامہ اقبال اور تعلیمِ آدمیت

علامہ اقبال کے خیال میں علم وہ ہے جو قلب میں جاگزیں ہو کر شخصیت اور کردار میں تبدیلی لانے کا باعث بنے۔کیونکہ ایسے علم کے حامل انقلابی لوگ ہی معاشرے میں کوئی نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پروفیسر محمد منور نے تعلیم کے بہت سے پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے اور عملِ تعلیم کی ناقص اٹھان کو معاشرے کے گوناگوں مسائل کی جڑ قرار دیا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ محض تعلیم میں ترقی انسان کی ترقی کا باعث نہیں ہے ۔ہم جب علمِ نافع کی دعا کرتے ہیں تو اس سے دراصل ایک ایسا ہی علم مراد ہے جس سے فکر ونظر تبدیل ہو جائیں ۔اس طرح سے آدمی میں آدمیت کی صفات پیدا ہوں گی ۔محض علم کی ڈگریوں کے مالک شخص کو ہمدرد نرم خو خوش اخلاق نہیں کہا جا سکتا ۔اگر اس کا علم منفی سمت میں راہنمائی کرے تو ایسا انسان فساد کا باعث بن کر اہلِ دنیا کے لیے خطرے کی علامت بن جاتا ہے۔اس لیے قرآن نے کہا ہے:

فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۱۲

پروفیسر محمد منور کے خیال میں علم کی وساطت سے آرام و آسائش اور گونا گوں لذتوں کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔لیکن ان سب کا حاصل ہو جانا کسی انسان کے بہترین ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ عین ممکن ہے کہ ایک غیر تربیت یافتہ شخص علم کو تن پروری کا ذریعہ بنا کر اپنی تباہی کا سامان پیدا کر لے۔(ص ۱۲) بلا شبہ ڈگریوں کے حامل، طب اور سائنس میں مہارت رکھنے والے اصحاب کثرت سے موجود ہیں لیکن ایک شخص بیک وقت علم کا بلند مینار اور کردار کا تاریک غار ہو سکتا ہے اور یہ کوئی امرِ محال نہیں۔(ص ۱۹) کیونکہ بقول اقبال:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے ۱۳

بہترین اخلاقی نظام کے لیے جو اخلاقی ڈھانچا مطلوب ہے، وہ مسلمانوں میں صدیوں تک قائم رہا۔اس اخلاقی نظام کو میسر آنے والے دراصل بے لوث معلم تھے۔جنھوں نے بلا معاوضہ تعلیمی و تربیتی امور اپنے ذمے لیے۔یہ درویش لوگ تھے۔ اپنی روزی کے لیے تجارت اور صنعت و حرفت کا سہارا لیتے اور فارغ اوقات میں تعلیم دیتے تھے۔لہٰذا مسلمانوں کی تقدیر بدل گئی۔اس کے برعکس آج کے معلموں نے اکتسابِ زر کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ہے اور پروفیسر محمد منور شاکی ہیں کہ آج وہ مزاج اور رویہ جسے اساتذہ اور معلمین سے منسوب کیا جانا چاہیے تھا، ناپید ہو گیا ہے۔(ص ۳۵) اقبال کہتے ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی ۱۴

اسی وجہ سے اقبال ان مدارس سے بدظن تھے۔ایسی صورت میں لازم ہے کہ استاد کے ساتھ ساتھ والدین بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔اس شعر کے حوالے سے پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ یہ فیضانِ نظر گھر سے چلنا چاہیے۔لیکن اگر گھر ہی میں

دوٗرخے کردار اور اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے گا تو پھر معاشرہ بہت بدل جائے گا۔ ایسی افراتفری کے عالم میں قوم کے محبوب اور سرپرستوں کو راہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے لیے آگے آنا چاہیے۔نیز ایسی تعلیم بھی شاملِ نصاب ہونی چاہیے جس میں بلند ہمت شخصیتوں کے احوال وسوانح دیے جائیں۔

علامہ اقبال حضور اکرم ا کے سامنے فریاد کرتے ہیں کہ اس دور میں مسلمان اسلام کی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔مکتبی علم نے اسے دین سے دور کردیا ہے'اور دین سے محرومی نے زندگی کے مفہوم سے بے بہرہ کردیا ہے۔ (ص۴۳)

الغرض آج کے معاشرے کی سب سے بڑی محرومی 'جوہر انسانیت' سے محرومی ہے۔ اس لیے جب تک تزکیہ نفس نہ ہو'اور روح آلائشوں سے پاک نہ ہو'اس وقت تک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاملات کا بار برداشت نہیں کیا جاسکتا۔(ص۴۴) اور علم اور عمل کے تضاد کو دور کرنے کے لیے بقول اقبال:

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو ۱۵

❑ علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر

تقدیر'اقبال کی فکر کا ایک اہم موضوع ہے۔تقدیر کے باب میں علامہ کے نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر 'خودی' کی مکمل تفہیم ممکن نہیں ہے۔ اقبال تو تقدیر کو بدل دینے کے قائل ہیں۔اور آپ کا خیال ہے کہ قوموں کو بھی اس خیال پر یکسو ہوجانا چاہیے کہ ہماری تقدیر بدلی جاسکتی ہے۔

اقبال کی اس سوچ کا آغاز اس نکتے سے ہوتا ہے کہ یہ کائنات ابھی نامکمل ہے۔ہر نیا دن' نئے امکانات کے ساتھ طلوع ہوتا ہے تو اس نئے دن کے تقاضوں کا ساتھ

دینے کے لیے کاوش اور محنت کرنا ازبس ضروری ہے۔ کائنات ابھی تکمیلی مراحل میں ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں ۱۶

اور اسی تصور سے ہم یہ بات بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تقدیر جامد نہیں ہے کہ ایک بار اس کو طے کر لیا گیا تو پھر اس میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ بلکہ تقدیر تو زورِ بازو سے بدلی جا سکتی ہے۔ اگر ہم تقدیر یا عرفِ عام میں قسمت کو اپنی ازلی کمزوری بنا لیں' تو پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں گے۔ اقبال کے خیال میں اسی 'قسمت' پر قانع ہونے کی وجہ سے مسلمان منتظر فردا ہے اور غیر مسلموں نے دنیا کی امامت سنبھال لی۔

پروفیسر صاحب نے اقبال کے موقف کو ان کے دوسرے' تیسرے اور چوتھے خطبے کے علاوہ ان کے اشعار کی مدد سے بھی واضح کیا ہے اور جا بجا مختلف علما اور صاحبِ رائے افراد کے اقوال درج کر کے گفتگو کو زیادہ با معنی بنایا ہے۔

مسلمانوں نے جس تصورِ تقدیر کی وجہ سے اپنے عمل اور قوت کے راستے کو خود گم کیا' اس کے پیچھے بھی پوری تاریخ ہے۔ مگر خلاصہ کلام یہ ہے کہ انھوں نے خدا کا ایسا تصور قائم کر لیا جو وراء الورا اور قدیم سے خارج سے فیصلے نافذ کر رہا ہے۔ ۲۱ اور یوں اس بات پر مطمئن ہو کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ حالانکہ خدا نے انسان کو کائنات کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ اور کائنات کی جملہ قوتوں کو اس کے لیے مسخر بھی کر دیا۔ اسی اختیار کے استعمال سے انسان اپنے مقامِ آدمیت کا تحفظ کر سکتا ہے اور بقول مرزا محمد منور آدم کے ہاتھوں مقامِ آدمیت کا تحفظ حضرت علامہ کے نزدیک اثباتِ خودی ہے۔ (ص ۵۸) اور انسان اس اختیار کو استعمال کر کے کئی بلند درجات حاصل کر سکتا ہے، جبکہ حیوان کے لیے مدارج

نہیں ہیں، وہ حیوان ہی رہے گا۔ اس اصول سے پروفیسر صاحب ایک بڑا دلچسپ اور بامعنی نکتہ اخذ کرتے ہیں:

اگر انسان اپنی قوی تر اور کارآمد تر عقلی' فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو بدی کا ہتھیار بنالے تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی حیوان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کیا حیوان اپنی نوع کی اجتماعی ہلاکتوں کے لیے گیس چیمبر ز ایجاد کرسکتا ہے؟ یا ہائیڈروجن بم بنا سکتا ہے؟ (ص ۵۹)

لہٰذا شخصیت کی تعمیر ارادی اور مثبت سمت میں ہونی چاہیے۔ اور خودی کی تعمیر کا یہی اصول ہے۔ اگر ہم اپنے مادی جسم کے تمام تقاضے پورے کرنا شروع کردیں تو روح کثیف ہوجائے گی کیونکہ مادی وجود کے تقاضے ان گھڑ ہوتے ہیں اور بالکل حیوان کی مانند بھی۔ اقبال کے نزدیک شروع شروع میں اگرچہ طبیعی تقاضے نفس پر چھائے رہتے ہیں' لیکن اگر انسان کوشش کرے تو ان طبیعی تقاضوں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے اپنی منزل کا ہدف متعین کرنا چاہیے اور اللہ سے نئی تقدیر کا طالب رہنا چاہیے۔ الغرض ہر شے کے امکانات کا صحیح اندازہ اس کے اندر مضمر خیر کے پہلو سے ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم خلوص کے ساتھ اپنی تقدیر کو منتخب کریں۔

❑ علامہ اقبال اور براہیمی نظر

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ایمان جن جن واقعات اور آزمائشوں سے بڑھتا ہے زیر نظر مقالے میں ان سب مراحل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بتوں کو مسمار کرنا' ستاروں' سورج اور چاند پر غور کرنا' بچے اور بیوی کو بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آنا' بیٹے کی قربانی کے لیے عملاً تیار ہوجانا' یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک شاعر کی نگاہ' ایک عام انسان کی نگاہ سے بے حد مختلف ہوتی ہے۔

چنانچہ اقبال نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان پہلوؤں سے ابراہیمی نظر کا جو فلسفہ اخذ کیا ہے‘ وہ ہمارے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ہر طرح کے بتوں کو مسمار کرنے والے کے لیے ابراہیمؑ کو بطور ِعلامت استعمال کیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد منور:

> جب براہیمی کا مفہوم بت شکنی‘ ناپائدار سے کنارہ کشی اور لازوال سے لگاؤ کے طور پر علامہ اقبال کے یہاں متعین ہو گیا تو پھر اس کا استعمال خوب خوب ہوا۔ (ص۸۰)

اور یہ تب ہوا جب اقبال نے ستاروں‘ مہتابوں اور آفتابوں کے نظارے کے بعد بصارت سے بصیرت کا سفر طے کر لیا۔

اس کے بعد مرزا صاحب نے اقبال کے مختلف اشعار میں پوشیدہ مفاہیم اخذ کر کے ابراہیمی نظر کی تفصیل بتائی ہے۔

مرزا صاحب نے فکرِ اقبال کے زاویے واضح کرنے میں جابجا قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جو بھی لا الٰہ الا اللّٰہ کی صداقت کا قائل ہو جائے، اسے قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ زر‘ زن اور اولاد کی محبت کے بندھن سے بھی آزاد ہونا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے قربانی‘ محبت کی ایک رمز ہے اور اس محبت میں ہر باطل شے کو توڑ دینا وہ مضمون ہے جو حق کی جستجو اور جرأتِ اظہار کی علامت بن کر علامہ اقبال کے کلام میں رنگ بدل بدل کر جلوے دکھاتا ہے۔ (ص ۸۶)

علم بلاشبہ شخصیت کی تعمیر کرتا ہے مگر یہ اس کی ذہنی و نظری تربیت پر منحصر ہے کہ اس کے علم نے اس کی سیرت و کردار میں کمال پیدا کیا یا زوال۔ راہِ ہدایت پر چلنے والا شخص غلط اور صحیح کی تمیز کر سکتا ہے۔ اقبال نے اس بات کو ابراہیمی حوالے سے ان

الفاظ میں سمجھایا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم ۱۷

اقبال سمجھتے ہیں کہ وہ تمام شکوک وشبہات اور تمام تر واردات وتوہمات جنھوں نے نژادِنو کے دلوں میں ایک محشر بپا کر رکھا ہے' دراصل حق پرستی اور یزداں شناسی سے محروم ہوجانے کا نتیجہ ہیں۔ اقبال کا ایمان پختہ ہے، وہ دانشِ افرنگ سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور یہاں بھی وہ خلیل ہی کو اپنا راہبر بناتا ہے۔ ۱۸

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل ۱۹

اقبال کی دوررس نگاہ نے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ اسماعیلؑ کی فرمانبرداری دراصل ابراہیمؑ کی شخصیت کا کمال تھی۔ اور شخصیت جو تربیت کرتی ہے' وہ کتابوں کے کلمات سے نہیں ہوسکتی۔ (ص ۹۲) مرزا صاحب نے اقبال کی اس بصیرت سے یہ نکتہ اخذ کرکے ایک عملی اصول بیان کیا ہے:

اس سے لازم آتا ہے کہ عزیزوں کو ناپسندیدہ سے باز رکھنے اور پسندیدہ کی جانب راغب کرنے والے اصحاب خود اپنے کردار کا جائزہ لیتے رہیں۔ ایک باپ' ایک استاد' ایک خطیب' ایک افسر' ایک بالادست عہدیدار' ایک سیاسی رہنما' ایک دینی مبلغ' غرض ہر وہ شخص جسے دوسروں سے کام لینا ہے یا دوسروں کی اصلاح وتربیت کرنا ہے یا ان کی سیاسی رہبری کرنا ہے، اسے جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اس کی ذاتی مثال کیسی ہے؟ (۹۲'۹۳)

افکارِ اقبال سے اس طرح کے قیمتی اور نادر نکات اخذ کرنا پروفیسر محمد منور کا خاص وصف ہے' جو انھیں دیگر اقبال شناسوں سے ممتاز کرتا ہے۔

علامہ اقبال اور حیاتِ بعدالموت

پروفیسر محمد منور مضمون کے آغاز میں کہتے ہیں کہ موت لازمہ حیات ہے' پھر بھی ہر ذی روح اس سے خائف رہتا ہے۔ کچھ افراد طبعی موت سے ہم کنار ہوتے ہیں' کچھ شہادت کی منزل حاصل کرتے ہیں اور کچھ خودکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں' مگر پھر بھی ہر انسان چاہتا ہے کہ دیر تک جیتا رہے' اور اگر وہ نہ رہے تو اس کی نشانیاں ہی باقی رہ جائیں۔ (ص ۳۹)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ 'خفتگانِ خاک سے استفسار'، 'کنارِ راوی' 'فلسفہ غم' اور 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' جیسی منظومات میں آپ کا فلسفہ حیات بعدالممات یکجا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں محمد منور صاحب نے موت کے بارے میں قدیم مصریوں' ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کے عقائد اور حقائق کے حوالے سے مفید معلومات جمع کی ہیں۔ آپ نے متعدد مغربی مصنفین کے خیالات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ بعدازاں قرآنی آیات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اقبال کا فلسفہ دراصل قرآن کے فلسفے ہی سے ماخوذ ہے۔

موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوال اقبال کے ذہن میں بھی پیدا ہوئے' مگر یہ تمام سوالات آپ کے ہاں یقین کی کیفیت پر منتج ہوتے ہیں۔

پروفیسر محمد منور صاحب وضاحت کرتے ہیں کہ اقبال کے خیال میں حیات و موت دراصل ایک تسلسل ہے۔ مرنے والے سے دوری دائمی دوری نہیں ہوتی۔ مگر جدائی کے احساس سے بے تاب ہونا طبعی اور قدرتی بات ہے۔ اقبال نے 'فلسفۂ غم' میں موت کا جو فلسفہ بیان کیا ہے، منور صاحب کے خیال میں حضرت علامہ نے ایک

موت کا نہیں بلکہ ہر موت کا تعزیت نامہ تحریر کر دیا ہے۔ 'خفتگانِ خاک سے استفسار' کے برعکس 'فلسفۂ غم' اور 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اقبال نے درد و کرب اور احساسِ جدائی کو آخر کار امید و آرزو میں بدل دیا ہے اور یہ اصول اخذ کیا ہے کہ انسان کے وجود کا اندرونی تقاضا ہے کہ وہ خاک سے برآمد ہو، زمین اس کو مسلسل اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اقبال حیات بعد الموت پر یقین رکھتے ہیں۔ برزخ کو 'موت' اور 'حیات بعد الموت' کے درمیان توقف و انتظار کی ایک حالت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ (ص ۴۲) گویا شعور کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا اور خودی زندہ ہو تو موت اس کو مار نہیں سکتی۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے ۲۰

گویا بقائے دوام انسان کا حق نہیں' بلکہ یہ اس کی خودی کی کاوش پر منحصر ہے۔

پروفیسر محمد منور' اقبال کی بحث کا حاصل یہ نکالتے ہیں کہ جس کی خودی جتنی طاقت ور ہو گی، وہ برزخ کی منزل اتنی ہی تیزی سے طے کر لے گا۔ اسی وجہ سے قرآن کے مطابق شہدا کی زندگی کا بظاہر خاتمہ ہوتا ہے' مگر حقیقتاً وہ زندہ ہوتے ہیں۔ (ص ۴۴) اس سے اقبال کے بقائے دوام کے فلسفے کی تائید ہوتی ہے۔ جن کی خودی نہایت عدمِ استحکام کا شکار رہے گی' وہ حیات بعد الموت سے محروم رہیں گے' برزخ میں بھی اور اس کے بعد بھی۔

اس بحث کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ حیات بعد الممات جسمانی ہو گا یا نہیں اور کیا وہی جسم ہوں گے؟ یا اس میں کچھ تبدیلی ہو گی۔ مرزا محمد منور نے اس باب میں غزالی کے خیالات بھی بیان کیے ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ تمام فلاسفہ اسلام اور علمائے الٰہیات

کے درمیان جو امر متفق فیہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی بعثت ثانیہ پر اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا۔(ص ۱۱۸، ۱۱۹) اقبال کا رجحان بھی اس جانب ہے۔وہ کہتے ہیں:

حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو، البتہ یہ نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔۲۱

مقالے کے آخر میں جناب محمد منور صاحب ایک نہایت ایمان افروز اور حیات بخش نکتہ اٹھاتے ہیں:

حیات بعد الموت کا تصور اگر عقیدے کی شکل اختیار کر لے تو حیاتِ آدم کی بہت سی لایعنیت ختم ہو جائے اور آدمی اس عقیدے کی بدولت ایک زندہ امید سے ہم کنار ہو کر اپنے وجود کو اور اپنے ماحول کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگ جائے۔(ص ۱۲۰)

❑ علامہ اقبال کا تصورِ ملت: ماضی، حال، مستقبل

زیر نظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے 'قومیں اوطان سے بنتی ہیں' کے فکری مغالطے کو فکرِ اقبال کی روشنی میں غلط ثابت کیا ہے۔آپ کے افکار کا اہم ماخذ ملت کے بارے میں اقبال کے افکار ہیں۔اقبال نے محض ملت کے مفہوم ہی کی صراحت نہیں کی، بلکہ ماضی کا ذکر، حال کے مسائل اور مستقبل کے درپیش چیلنجوں پر بھی بڑی واضح رائے پیش کی ہے، جو اسلام کی پوری فکر کا احاطہ کرتی ہے۔

پروفیسر محمد منور نے ملت کا مفہوم متعین کرنے کے ساتھ ساتھ، غیر مسلم اقوام کے تصورِ قوم پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔غیر مسلموں کے ہاں اقوام کی بنیاد محض وطن یا نسل ہے۔اگر یہ بنیادیں نہ ہوں تو وہ بحیثیت انسان بھی ایک دوسرے کے حقوق اور انسانی اقدار کا تحفظ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔بلکہ انسانیت کی نچلی سطح پر پہنچ

کر اپنے ہی ابنائے وطن کے دشمن بن جاتے ہیں۔اس وطنی قومیت کے سبب مادہ پرستی ہی عمل اور ایمان بن جاتی ہے۔(ص ۱۵٦) جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے ۲۲

زمانہ حال کی اقوام کا یہ حال دیکھ کر ہی اقبال نے مسلمانوں کو ان کے ماضی اور ماضی کی شاندار روایات کی طرف متوجہ کیا۔ان کے مطابق تو حید و رسالت ہی وہ پایدار اور دائمی اقدار ہیں جن پر مسلم ملت کی بنا قائم ہے۔'ملت' کا لغوی معنی تو ہے ہی دین ۔اگرچہ فی زمانہ ملت کے لیے انگریزی میں لفظ Nation استعمال ہوتا ہے' جس سے ملت کے عناصر یعنی وطن' نسل' زبان' تاریخ اور تمدن بہت نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیکن مسلم ملت کی اساس دیگر اقوام کی اساس سے بالکل مختلف ہے' بقول حضرت علامہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری ۲۳

یہاں مرزا صاحب نے ہندوؤں اور یہودیوں کے تصورِ قومیت پر بھی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تصور' تعصب اور تنگ نظری کو راہ دیتا ہے۔اور یہ اقوام صحیح معنوں میں

اقوام نہیں ہیں کیونکہ اندرونی طور پر یہ خود اپنے ہی باشندوں کو دشمن اور بدخواہ تصور کرتی ہیں۔(ص ۱۲۷'۱۲۸)

وطن کے بعد اتحادِ قومی کا دوسرا عنصر 'نسل' ہے اور اسی سے رنگ بھی وابستہ ہے۔ پروفیسر محمد منور نے اس کو کھلی بت پرستی قرار دیا ہے۔(ص ۱۲۹)اس کے برعکس جو شخص ایک خدا کو پوجے گا،اس کے اندر ایک بے کراں اور لامحدود وسعت نظر آئے گی ۔اسلام نے رشتوں کی بنیاد دین پر استوار کی ہے،اس لیے غزوۂ بدر میں دینی رشتے ایک طرف تھے اور خونی رشتے دوسری طرف' اور یہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔مسئلہ'وطن کے تحفظ کا نہ تھا' بلکہ دین کی حفاظت کا تھا۔مرزا محمد منور کے الفاظ میں یہ کفر اور اسلام کا مسئلہ تھا' یہ نور اور ظلمت کا مسئلہ تھا۔(ص ۱۳۲)

اہلِ اسلام کے لیے آج بھی یہ تمام عناصر اسی طرح سے موجود ہیں۔یہ نعمت کسی اور ملت یا قوم کو میسر نہیں ہے۔ان نعمتوں کی وجہ سے بقول اقبال:

ملت از یک رنگیِ دل ہا ستے
روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے ۲۴

اور بقول پروفیسر محمد منور:

عالمِ اسلام سمندر کی طرح تھا' اور مسلمان اس میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے اور مچھلیاں خلیجوں' بحیروں کی سرحدیں نہیں جانتیں..... عالمِ اسلام کے علاقائی' سیاسی حاکم و سلطان محض علاقائی افسر تھے ..... کلمہ طیبہ پاسپورٹ تھا' السلام علیکم ویزا تھا۔(ص ۱۴۸)

اس خوش گوار ماضی سے حال کے زمانے میں آئیں' تو انگریزوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کر کے انھیں مختلف اوطان کی حدود میں قید کر دیا' مگر یہ مصنوعی حد بندیاں بھی ان کے تصورِ آفاقیت کو مسخ نہیں کر سکیں۔بقول اقبال:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم۲۵

رنگ، نسل، نسب کے تصور پر استوار وطن کا تصور ہندستان میں بھی ابھرا۔ اس وقت بھی اقبال نے مسلمانوں کو اس فتنے سے خبردار کیا۔ مولانا حسین احمد کے حوالے سے اقبال نے متفکر ہو کر کہا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است۲۶

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تصورِ قومیت کی سمت درست رکھنے کے لیے مسلم دنیا میں کوئی نہ کوئی تحریک اٹھتی رہتی ہے اور مسلمان 'دھرتی پوجا' کا نظریہ قبول کر کے خاک باز نہیں بن سکے۔ (ص ۱۵۷)

مستقبل میں خطرہ ہے کہ انگریز اور دیگر یورپی اقوام انگریزی زبان اور نصابِ تعلیم کے ذریعے ان پر غلبہ پا لیں گے تو خطرہ ہے کہ مسلمان اپنے علاقائی مسائل میں گرفتار ہو کر رہ جائیں گے اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی کچھ بھی مدد نہ کر سکیں گے۔ پروفیسر محمد منور نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ یہ انگریز کی چال ہے، کہتے ہیں:

یورپی حاکموں نے سوچا: چلیے مسلمان 'نئی روشنی' کے شوق میں مسیحی نہ ہوئے نہ سہی' مگر ان کے دینی نظریات کی اساس میں تزلزل واقع ہوگا..... مثلاً قوموں کے حقِ خودارادیت کو اگر نعرۂ آزادی بنایا جائے گا تو اس کا نتیجہ علاقائی اور وطنی قومیت کے عقیدے کا رسوخ ہوگا۔(ص ۱۵۵)

یہ اندیشہ مرزا صاحب کی بالغ نظری کا بیّن ثبوت ہے۔آخر میں پروفیسر صاحب ایک نہایت اہم سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا حضرت علامہ کا تصورِ ملت کبھی آگے چل کر سیاسی اتحاد کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔(ص ۱۶۴) آپ کے خیال میں جو لوگ اسے محض ایک جذبہ سمجھتے ہیں' وہ غلط سمجھتے ہیں۔مسلم اقوام عملاً 'ملت' بننے کے خواہاں ہیں ۔ جدہ کا اسلامی سیکریٹریٹ' اور اسلامی ملکوں کے وزراے خارجہ کی تنظیم OIC اس کا ایک عملی ثبوت ہیں۔

یہ مضمون بہت مفصل اور جامع ہے اور پروفیسر منور کے وسیع مطالعے اور ان کی بھرپور قوتِ استدلال اور تحریری صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

❑ علامہ اقبال اور مرگِ مجازی

اس مقالے میں مرزا محمد منور صاحب نے قارئین کو 'موت' کے ایک نئے معانی سے روشناس کرانے کی سعی کی ہے۔موت حقیقی بھی ہوتی ہے اور غیر حقیقی بھی۔غیر حقیقی موت دراصل دل کی موت ہے' جس میں روح اور جسم تو ظاہری طور پر زندگی اور اس کے لوازمات سے معمور رہتے ہیں۔اس وجہ سے دل کی ایسی 'مصنوعی' موت کو 'مرگِ مجازی' کہا ہے کہ دل بطور ایک عضوِ جسم کے تو زندہ و بیدار رہتا ہے مگر اس کی روحانی موت واقع ہو چکی ہوتی ہے۔مرزا صاحب نے اس مفہوم کو ایک نئی ترکیب 'مرگِ مجازی' سے تعبیر کیا ہے۔

مادی جسم کی ظاہری پرورش اور نمود کچھ مشکل کام نہیں ہے۔لیکن جب یہ مادی جسم دنیاوی لذتوں میں گم ہونے لگے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے دل کی موت واقع ہوجائے۔کیونکہ دل مادی آلائشوں کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا اور مادی آلائشیں دل کی آنکھوں' کانوں اور زبان کو ختم کرنے کا سب سے موثر ہتھیار ہیں'اور ایسی زندگی ہی کو پروفیسر محمد منور مرگِ مجازی کہتے ہیں'علامہ اقبال اس بارے میں کہتے ہیں:

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ' زندوں کا خدا ہے ۲۷

اگر یہ رویہ فرد سے گزر کر اُمت کے کثیر افراد کا شیوہ بن جائے تو پھر معاشرے میں زبوں حالی اور نفسانفسی کا چلن عام ہوجائے گا۔خواہشاتِ نفس کا بڑھ جانا' مادی فوائد کے حصول میں انہماک' اقدار کی بجائے دولت کو ترجیح' یہ سب وہ عوارض ہیں'جو افراد کولاحق ہوتے ہیں تو معاشرہ بھی پراگندگی کا شکار ہوجاتا ہے۔پروفیسر محمد منور کے خیال میں ایسے افراد پر مبنی معاشرے کو'وحوشستان' کہا جاتا ہے۔کیونکہ یہاں پر 'شر'اور'بدی' ایک فیشن بن جاتا ہے۔(ص ۱۷۲) افراد محض نقالی کرتے ہیں۔روح مردہ ہونے کے باعث دانش وری بھی محض فیشن ہی ہوتی ہے۔بے کار افراد اور نظریات عام ہوجاتے ہیں اور وہ قوم دل سے خالی ایک مردہ قوم بن جاتی ہے۔ جیسے اقبال کہتے ہیں:

زندگی سوختن باساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن ۲۸

ایسے معاشروں میں زندہ دل افراد نایاب ہوتے ہیں اور صاحبِ یقین افراد اپنے معاشرے کے تنِ مردہ میں ازسرِنو جان پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان افراد کو مسئولیت کا احساس ایک مستی اور نشہ سا عطا کر دیتا ہے۔(ص ۱۸۰) انھیں دیوانہ کہا جاتا ہے مگر ان کی یہی دیوانگی بالآخر قوموں کی دوبارہ زندگی کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کے سامنے پیغمبروں کا اسوہ ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف' مرگ حیاتِ بے شرف ۲۹

ان افراد کی اس جہدِ مسلسل کے پیچھے دراصل' موت کے بعد کی دائمی زندگی کی زبردست تمنا کارفرما ہوتی ہے۔ اس پوری بحث سے پروفیسر صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر یہی ایمان کا ولولہ' خلوص اور حیات بعد الموت کا تصور' مردہ دلوں میں راسخ کر دیا جائے' جواب دہی کا احساس بیدار کر دیا جائے تو ایسے افراد اور معاشرے میں بھی زندگی کی نئی رمق پیدا ہو سکتی ہے۔(ص ۱۸۱)

❑ فقر، کلامِ اقبال کی روشنی میں

زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے سب سے پہلے فقر کے معنی متعین کیے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال کے ہاں فقر کے تصورات یک بیک پختہ نہیں ہوئے بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ مشاہدے' مطالعے اور قوتِ غور و فکر کی بدولت ہی آپ کے ہاں فقر کے معانی متعین ہوئے ہیں۔ شروع میں فقر اپنے معمولی معنوں میں وارد ہوا' مگر اس کے بعد 'خطاب بہ جوانانِ اسلام' میں واضح تبدیلی محسوس ہوتی ہے:

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را ۳۰

لفظ 'فقر' بھی لغوی اور اصطلاحی معنوں میں قدرے مختلف مفاہیم رکھتا ہے۔ لغوی

معنوں میں فقر تنگ دستی، غریبی اور مفلسی ہے۔ جبکہ اصطلاحی معنوں میں یہ دل کی وہ کیفیت ہے جس میں دل مادی اور ظاہری اشیا کی حرص، طلب اور ضرورت سے بے نیاز ہو جائے۔

زیرِ نظر کتاب میں پروفیسر محمد منور نے فقر کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کو لغات کے علاوہ کشف المحجوب میں منقول صوفی حضرات کی مثالیں بیان کر کے بھی واضح کیا ہے۔ فقرائے اہلِ اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے ہیں۔ انھوں نے دین و شریعت کے بارے میں خلافِ دین و شرع امور کی تائید کبھی نہیں کی۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ علامہ اقبال بار بار اپنے معاصر صوفی و ملا پر طنز و تعریض کرتے ہیں، کیوں کہ فقر کی ظاہری عادات و آداب اختیار کر لینے کے باوجود، ان کے اندر جرأتِ کردار کی خصوصیت نہیں ہے۔ محض خانقاہ نشین ہو جانے سے ان کے اندر وہ مقناطیسی قوت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کریں۔ اقبال نے جب بھی امت کے زوال پر بات کی، تو ان تمام درویش منش ظاہری فقیروں پر طنز کیا ہے:

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ ۳۱

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی ۳۲

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے ۳۳

پروفیسر منور صاحب نے اس پورے مضمون کا حاصل ایک بڑے بامعنی جملے میں

یوں پیش کیا ہے: لُبِ لباب یہ کہ فقر ایک مزاج کا نام ہے اور وہ مزاج سرتا سر دلِ بے نیاز و غنی کی بخشش ہوتا ہے۔ (ص ۲۱۸)

ایقانِ اقبال: مجموعی جائزہ

ایقانِ اقبال کے مضامین' ان کے موضوعات' اور اسلوب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب ایک مشنری جذبے کے تحت لکھے گئے ہیں۔ جسٹس ایس اے رحمان کہتے ہیں:

موضوعات کا انتخاب خود ان کی علمی دلچسپیوں کی نوعیت کا غماز ہے...... ان موضوعات سے شغف اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی توجہ اسلوب سے زیادہ اقبال کے مغزِ فکر پر مرکوز ہے۔ (ص ۷)

ان مضامین میں ہر بات بڑے تیقن اور پُر اعتماد طریقے سے کی گئی ہے۔ مصنف نے بڑی دقتِ نظر اور مہارت سے موضوع کا احاطہ کیا ہے۔

ان کے اندازِ بحث و اسلوب کا ایک نمونہ یہ دیکھیے:

اگر فیضانِ نظر گھر سے نہ چلے تو مکتب کی کرامات بھی مشکل ہی سے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ والدین کو اگر اولاد کی تعلیم کا غم لاحق رہتا ہے تو ان پر لازم ہے کہ تربیت کا خیال بھی رکھیں اور اس کے لیے اپنے آپ پر بھی کچھ پابندیاں عائد کریں' تا کہ بچوں کے لیے نظم و ضبط اور حق و صداقت کا ایک قابل تقلید نمونہ بن سکیں۔ (ص ۳۸)

مرزا صاحب 'ملت' ماضی' حال' استقبال' کے موضوع پر بات کرتے ہوئے ملت کے اجزائے ترکیبی میں مکہ کے بین الاقوامی اجتماع' حج کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس کے بالمقابل آج کے بین الاقوامی ادارے' اقوام متحدہ کی ' کارکردگی' پر بھی رائے دیتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ بڑی طاقتوں کا اکھاڑا ہے' جو چھوٹی طاقتوں کی سیاسی اور

فکری اکھاڑ پچھاڑ کرتی رہتی ہے ...... یہ ادارہ بظاہر دنیا کا اہم ترین بین الاقوامی ادارہ ہے‘ مگر یہ ادارہ اولادِ آدم کو مثبت قدریں عطا نہ کر سکا۔ جھوٹ کو سچ کر دکھانا‘ اور سچ کو جھوٹ‘ ظالم کو مظلوم ثابت کر دینا اور مظلوم کو ظالم‘ مادی مفاد کو انسانی و اخلاقی قدروں پر ترجیح دینا‘ وہ درس ہیں‘ جو معاصرِ عالم انسانیت کو احترام آدمیت کے تصور ہی سے محروم کر دیتے ہیں۔ (ص ۱۴۳)

یہ مثالیں بظاہر ایک ایسے مضمون کا حصہ محسوس ہوتی ہیں‘ جو عام حالات کے تجزیے و تبصرے کے طور پر لکھا گیا ہو۔ مندرجہ بالا سطور میں فکرِ اقبال کا براہِ راست کوئی تذکرہ نہیں ہے مگر بہر حال یہ فکرِ اقبال کے مبسوط مقالے ہی سے اخذ کی گئی سطور ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محمد منور فکرِ اقبال کے مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ اور پاکستان کے لیے متفکر رہتے تھے۔ میرزا ادیب کہتے ہیں کہ پروفیسر منور کے ہاں یہ دو اجزا [اقبال اور پاکستان] ایک دوسرے سے اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ ان کی ترتیب فقط ایک ہی جزو میں منتقل ہو گئی ہے۔ اقبال کو مصورِ پاکستان کہا جاتا ہے اور پاکستان خوابِ اقبال کی عملی تعبیر ہے۔ اس طرح دونوں باہمی آمیزش سے ایک جزو بن گئے ہیں۔۳۴

جناب جسٹس ایس اے رحمان محمد منور صاحب کی اس کتاب کے دیباچے میں آپ کے اندازِ اُسلوب کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

یہ مضامین، ان کی وسعتِ مطالعہ پر دال ہیں اور ان کی دل آویز نکتہ طرازیوں کے نمونے۔ انھوں نے فکرِ اقبال کے ڈانڈے کامیابی کے ساتھ جدید نظامِ فلسفہ اور قدیم مشرقی روایات سے ملائے ہیں۔ انھوں نے قرآن و حدیث سے بھی استشہاد کیا ہے‘ اور ادب‘ فلسفہ اور تصوف کے دفاتر سے بھی۔ ان کا اندازِ تحریر صاف و شفاف ہے اور انھوں نے جو کچھ اقبال سے پایا ہے، شرح و بسط سے دوسروں تک پہنچانے

کی بلیغ سعی کی ہے۔(ص ۷)

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

علامہ اقبال کی فارسی غزل

علامہ اقبال پر پروفیسر محمد منور کی یہ دوسری کتاب ہے، جو میزانِ اقبال کے ۵ سال بعد سامنے آئی۔ اس میں علامہ اقبال کی فارسی غزل کا ۹ دوسرے فارسی غزل گو شعرا سے موازنہ کیا گیا ہے اور آخری حصے میں علامہ اقبال کی انفرادیت اور سبکِ اقبال کے حوالے سے اقبال کی فارسی غزل پر مبسوط گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ:

اس تقابلی مطالعے کو پہلے سے کسی طے شدہ نتیجے پر پہنچانا ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ یہ مطالعہ اپنی دلالتوں کے زور سے مجھے جس طرف لے گیا، میں اسی طرف چلا...... میں اپنی ناقص رائے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علامہ اقبال کی غزل ان تینوں سبکوں میں سے کسی ایک میں بھی نہیں سما سکتی، گویا ان کی غزل خود اپنی ذات میں ایک سبک ہے، سبکِ اقبال۔ (ص ۲۸)

اقبال کے فکر و نظریات کے بارے میں ادبی و فکری مضامین کے بعد یہ ایک نئی سمت ہے، جس پر پروفیسر محمد منور نے قلم اٹھایا ہے اور دراصل یہ مجلّہ صحیفہ کے اقبال نمبر کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے پر زور اصرار پر لکھا گیا طویل مقالہ ہے، جو پھیل کر کتاب بن گئی ہے۔ بقول پروفیسر محمد منور: یہ کتاب میں نے لکھی نہیں، مجھ سے لکھوائی گئی ہے۔ (ص ۲۶)

اس کتاب کا پہلا اڈیشن بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر شائع کیا۔ بعد ازاں یہ اقبال اکادمی سے بھی شائع ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب 'ذہین طالب علم' کامیاب استاذ' صاحبِ طرز ادیب' دراک ناقد' خوش ذوق شاعر' شیریں گفتار' علامہ اقبال اور قائد اعظم کے ارادت مند شیدائی اور

میرے عزیز دوست پروفیسر نصیر احمد ناصر مرحوم کے نام' ہے۔(ص ۲)

دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کے قلم سے ہے۔ آپ کے خیال میں مرزا صاحب علامہ اقبال پر لکھنے کے لیے موزوں اور جامع الشرائط شخص ہیں اور مرزا صاحب نے علامہ اقبال کی فارسی غزل کو فارسی شاعری کی روایتِ غزل کے پس منظر میں رکھ کر اس کا مقام متعین کیا ہے۔(ص ۱۱) جناب شبلی صاحب کے خیال میں یہ کام اس لیے بھی اہم اور ہمت طلب ہے کہ: فارسی شاعری کے بحرِ بیکراں میں سے اس تقابلی مطالعے کا مواد نکالنا آسان بات نہیں' ان دواوین میں ڈوبنا آسان ہے مگر ڈوب کر ابھرنا خاصا محال ہے۔(ص ۵)

پروفیسر محمد منور نے اقبال اور حافظ کا جو موازنہ کیا ہے، اس کے بارے میں شبلی صاحب کا خیال ہے کہ مرزا صاحب نے' حافظ کی بدنامی یا رسوائی کا ذمہ دار حافظ کو نہیں سمجھا' بلکہ انتخاب کنندگان کو قرار دیا ہے' تو یہ دلیل حافظ کو شک کا فائدہ پہنچانے کی ایک مخلصانہ کوشش معلوم ہوتی ہے۔(ص ۱۵)

ڈاکٹر شبلی صاحب دیباچے میں مزید لکھتے ہیں:

وہ معلم ضرور ہیں لیکن غرورِ علم میں مبتلا ہو کر مخاطبوں پر اپنے علم کے تازیانے نہیں برساتے......مثالوں سے بات کی وضاحت کرتے ہیں' مثالوں کی کثرت ایک طرف تو ان کے وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہے' اور دوسری طرف ان کے مقالات کی ایک نمایاں خصوصیت بھی ہے۔(ص ۱۷)

جناب شبلی کا کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ کتاب اقبال اور دوسرے کئی نامور غزل گو شعرا کے منتخب اشعار کا اچھا خاصا مجموعہ بھی ہے۔(ص ۱۸)

ذیل میں اقبال کی فارسی غزل کے مضامین کا تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے

علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز

زیرِنظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے اس امر پر بحث کی ہے کہ اقبال کے ہاں فارسی شاعری کا آغاز کب ہوا؟

معروف بات ہے کہ سر عبدالقادر کے مطابق اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز قیام انگلستان کے زمانے میں ہوا لیکن محمد منور صاحب نے سید نذیر نیازی کی ایک روایت کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت علامہ لاہور تشریف لانے سے قبل فارسی میں بھی شعر کہنا شروع کر چکے تھے۔ مرزا محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں کچھ ایسا حصہ موجود ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ انگلستان جانے سے قبل بھی فارسی میں اشعار کہہ رہے تھے۔

مرزا صاحب نے اقبال کی ۱۹۰۲ء کی ایک نظم بعنوان 'اسلامیہ کالج کا خطاب' پنجاب کے مسلمانوں سے' کے بعض اشعار اس مضمون میں درج کیے ہیں۔ اس نظم کے نو بند ہیں' اور پہلے آٹھ بندوں میں ہر بند کا آخری شعر فارسی کا ہے' پھر ۱۹۰۲ء ہی کی ایک اور نظم 'شکریۂ انگشتری' ہے جو باقیاتِ اقبال مرتب: سید عبدالواحد معینی صفحہ ۱۳۱ پر درج ہے۔ اس نظم کے ۱۶ اشعار فارسی میں ہیں اور ۷ اردو میں ہیں۔

اسی طرح جنوری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع نظم 'سپاس جناب امیر' ہے۔ یہ بھی سفرِ انگلستان سے پہلے کی ہے۔ مصنف نے اس کے پہلے چھ اور آخری چار شعر مضمون میں بطور حوالہ درج کیے ہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کی فنی خوبیوں کے بارے میں پروفیسر محمد منور کہتے ہیں:

بہر حال محولہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کو فارسی شعر گوئی پر بھی شروع ہی سے تقریباً وہی قدرت حاصل تھی جو اردو پر تھی۔

مصرعوں اور شعروں کے دروبست سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ اشعار مشقت کا ثمرہ ہیں ۔ یہ اشعار کسی طرح بھی ابتدائی معلوم نہیں ہوتے ورنہ وہ یوں ڈھلے ڈھلائے اور کامل عیار نہ ہوتے ۔(ص ۴۳'۴۴)

خود بھی اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آ گئی 'جبکہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی 'انھیں معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے اسکول ہی کے زمانے سے کس قدر زحمت اٹھائی اور اساتذہ سے استفادہ کیا ۔۳۵

بقول ڈاکٹر محمد صدیق شبلی 'مرزا صاحب کا یہ موضوع خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔ (ص ۱۸)

❑ علامہ اقبال اور خواجہ شیراز

اقبال اور حافظ کے فنی اور فکری سفر کے بارے میں متعدد نقادوں اور تحقیق کاروں نے قلم اٹھایا ہے اور دونوں کے مابین مماثلت اور اختلاف کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ زیرِ نظر کتاب کا بنیادی مقصد ہی یہ جائزہ لینا ہے کہ اقبال پر کس فارسی شاعر کے اثرات سب سے زیادہ ہیں ۔ اس تقابلی جائزے میں پروفیسر محمد منور نے خواجہ حافظ شیراز کو مقدم رکھا ہے ۔

علامہ اقبال کی غزل باعتبار رنگ و آہنگ جس قدر خواجہ حافظ کی غزل کے قریب ہے' اس قدر کسی اور فارسی شاعر کی غزل کے قریب نہیں ۔ خواجہ حافظ کے بعد سب سے زیادہ اثر نظیری کا دکھائی دیتا ہے' اور نظیری خود مقلدِ حافظ تھا ۔ (ص ٦٧) پروفیسر محمد منور کی اس رائے سے ڈاکٹر محمد ریاض بھی اتفاق کرتے ہیں اور عبدالشکور احسن بھی ۔ ڈاکٹر محمد ریاض کہتے ہیں کہ :نظیری کے بعد غالباً اقبال ہی وہ شاعر ہیں 'جنھوں نے

خواجہ شیراز کی زمین میں بے باکانہ چہل قدمی کی ہے۔۳۶ پروفیسر عبدالشکور احسن کہتے ہیں:

ان کی غزلیات بالعموم اور پیامِ مشرق کی غزلیات بالخصوص اپنے انداز میں دوسرے شعرا کے مقابلے میں حافظ کے رنگ سے زیادہ قریب ہیں۔۳۷

مگر اسرارِ خودی کے دیباچے میں حافظ شیراز کے خلاف اقبال نے شدید جذبات کا اظہار کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

وہ ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراضِ زندگی کے منافی ہے' بلکہ زندگی کے لیے مضر ہے۔ جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں' وہ حالت افراد و قوم کے لیے نہایت ہی خطرناک ہے۔۳۸

۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق میں اقبال نے حافظ کے بارے میں عقیدت مندانہ اشعار کہے ہیں۔ یہ کھلا تضاد ہے۔ ان دونوں شعری مجموعوں کے درمیانی عرصے میں حافظ کے مدافعین نے اقبال کو ایک طرح سے خواجہ حافظ شیراز کا مخالف قرار دے دیا تھا۔ (ص ۵۳) مگر اقبال نے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی ہے' بلکہ بقول مرزا صاحب اقبال نے معذرت بھی کی ہے۔ (ص ۶۲) تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال حافظ کی ایسی شاعری کے خلاف ہی تھے' جو سطح المزاج اور زوال پذیر افرادِ معاشرہ کے قلوب و اذہان پر منفی اثر ڈال رہی تھی۔ اقبال خود بھی ایک خط میں کہتے ہیں:

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے ہیں' ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح و توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا..... لیکن عوام اس باریک امتیاز کو نہ سمجھ سکے اور بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن' حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں' خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین

شعرا میں سے ہیں۔۳۹

عبدالشکور احسن بھی حافظ اور اقبال کے درمیان فکری تضاد اور فنی مماثلت کے قائل ہیں اور وہ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ:

علامہ کے سامنے ایک طرف تو حافظ کی فکر کے بعض منفی پہلو تھے اور دوسری طرف اس شاعرِ جاویداں کے اشعار کی طلسماتی تاثیر تھی۔ انھیں یہ صورت حال انتہائی خطرناک دکھائی دیتی تھی' اور اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ پڑھنے والوں کو حافظ کی ساحرانہ ترغیبات سے متنبہ کریں۔۴۰

یہاں پروفیسر محمد منور ایک اور پہلو پر بھی گفتگو کرتے ہیں کہ جب تک ہم شاعر کی شاعری کے پس منظر' شاعر کے رجحانات کو پرکھنے والے دیگر عوامل کو نہ جانچ لیں' اس وقت تک ہم اس کی شاعری کے رمز و ایما کے مفاہیم کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے اور کوئی بھی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا کہ مذکورہ شعر کس سیاق کے پیش نظر وجود میں آیا ہے۔ اور حافظ کی غزلوں کے اردگرد کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے' جس سے ہم ان کے ذہنی وفکری رجحانات کو پرکھ سکیں۔ (ص ۶۴)

اس سلسلے میں پروفیسر محمد منور نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کو بڑا متوازن قرار دیا ہے' جو انھوں نے حافظ کی تائید میں ظاہر کی ہے' کہ جب ہم بادہ و ساغر کی اصطلاحوں کی اجازت دوسرے لوگوں کو دیتے ہیں تو بیچارے حافظ کو کیوں نہ مستثنیٰ کیا جائے۔

مگر اقبال پھر بھی مولانا جامی (حافظ کے قریب العصر بزرگ صوفی اور شاعر) کے برخلاف' حافظ کو صوفی نہیں تسلیم کرتے۔ اور بقول پروفیسر منور: اقبال جامی کے القابات، 'لسان الغیب' اور 'ترجمان اسرار' کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ (ص ۶۵) اسی طرح سے اقبال اپنے ایک خط میں مولانا اشرف جہانگیری کے ملفوظات کو بھی زیادہ معتبر قرار نہیں دیتے ۴۱ (جس میں اشرف نے حافظ کے بارے

میں مثبت رائے ظاہر کی ہے) حافظ کے فکری پہلوؤں کے بارے میں اقبال کی اس قدر سخت رائے کے باوصف، وہ فنی لحاظ سے حافظ کے مداح ہیں۔ پروفیسر محمد منور نے اقبال کا ایک خط بنام عطیہ بیگم کا حوالہ دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں: کہ جہاں تک فن کا تعلق ہے یعنی جو مقصد شعرا پوری غزل میں حاصل نہیں کر سکتے، خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کر تے ہیں۔

مرزا محمد منور نے اقبال کی دو درجن کے قریب ایسی ہم زمین اور ہم طرح غزلیات کی نشان دہی کی ہے جو حافظ کے رنگ اور اسلوب میں کہی گئی ہیں۔ مگر وہ خلیفہ عبدالحکیم کی اس رائے سے متفق نہیں کہ اقبال کی کئی غزلوں کو حافظ کے دیوان میں آ سانی داخل کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں پوری غزلوں کے باب میں یہ رائے صحیح نہ ہوگی۔ ہاں درجنوں اشعار کے ضمن میں ایسا کہا جا سکتا ہے۔ (ص ۷۶)

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پروفیسر محمد منور کی رائے یوسف حسین خاں کی رائے سے زیادہ قریب ہے کہ اقبال اپنے فنی پیشوا حافظ سے دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

❑ اقبال اور نظیری نیشاپوری

اس مضمون کے آغا میں پروفیسر محمد منور رقم طراز ہیں:

ایک ایسے شاعر کی رمز آشنائی داد طلب ہے جس کی مادری زبان فارسی نہیں؛ جس نے سرزمین ایران میں کبھی رہایش اختیار نہیں کی؛ جس نے ایرانی اہلِ زبان کی محفلیں کبھی شاذ و نادر ہی دیکھیں؛ اس کے باوصف وہ کلاسیکی فارسی زبان کے رنگ میں کاملاً رنگا ہوا ہے۔ (ص ۷۷)

داد طلب کرنے کے لیے آپ نے نظیری اور اقبال کے مطلع ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کیے ہیں۔ اور نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے درمیان ہم آہنگی موجود ہے بلکہ

اس قدر کہ اگر علامہ قبال کے کچھ مطلع نظیری کے کھاتے میں اور نظیری کے کچھ مطلع اقبال کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں تو چند خاص اقبال شناسوں کے علاوہ کسی کو پتا نہ چل سکے گا۔(ص ۸۳) لیکن اگر اقبال کی پوری غزلیات کو دیکھا جائے تو ان میں اقبالیت صاف معلوم ہوتی ہے۔(۸۴)اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نظیری کا یہ مسئلہ نہ تھا کہ اہلِ خاور کی خودی بیدار کرے اور مغربی قمار بازوں کے زوال کی خبر دے اور اہلِ خاور کو ان کے مقابل احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے باز رہنے کی تلقین کرے۔(ص ۸۵)

دیگر نقاد پروفیسر محمد منور کی اس رائے کے تو ہم نوا ہیں کہ اقبال بہر حال نظیری سے اثر قبول کرتے ہیں مگر وہ یہ نتیجہ نہیں نکالتے کہ نظیری کے مقابلے میں اقبال کا مقام بلند ہے۔ پروفیسر عبدالشکور احسن کہتے ہیں: ''نظیری کے مزاج میں عمل اور کردار کی وہ شجاعانہ صورت نظر آتی ہے۔جس کی طلب اقبال کو بے قرار رکھتی ہے۔''(ص ۴۲) زیرِ نظر مضمون میں موازنے کا انداز سادہ ہے اور مختصر دلائل دیے گئے ہیں۔اس کے باوجود مضمون' اپنے موضوع کی عمدگی سے وضاحت کرتا ہے۔

❑ علامہ اقبال اور مولانا روم

اس مضمون میں اقبال اور مولانا روم کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔رومی' اقبال کے پیش رو تھے۔اقبال ان سے اپنی بے پایاں عقیدت مندی کی وجہ سے انھیں 'پیر رومی' کہتے ہیں اور خود کو رومی کا مرید تصور کرتے ہیں۔وہ نہایت اخلاص اور وسعتِ قلب کے ساتھ ان کے احسانات کا اعتراف کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رومی کے زمانے میں مسلم معاشرہ زوال پذیر تھا اور اقبال کا زمانہ بھی مسلمانوں کی بے بسی اور بے کسی کا زمانہ تھا۔لہٰذا دونوں نے روحانی' فکری' اخلاقی اور مادی سطح پر قومی احیا کے لیے

ایک تو انا فلسفہ پیش کیا۔

پروفیسر محمد منور صاحب کے خیال میں اقبال کی شاعری پر فارسی شعرا میں سے حافظ اور نظیری کے بعد سب سے زیادہ اثر مولانا روم نے ڈالا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اقبال کی کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن کا آہنگ' بلکہ ترنگ مولانا روم کا سا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ مولانا روم کے ساتھ فکری' قلبی اور روحانی تعلق دوسرے شعرائے کبار کے مقابل استوار تر تھا۔(ص ۸۸)اس مقصد کے لیے پروفیسر صاحب نے آپ کی دونوں طرح کی غزلیات کے چیدہ چیدہ افکار کا حوالہ دیا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر محمد منور یہ بھی کہتے ہیں کہ دراصل مولانا روم کی مثنوی میں جتنے اور جیسے قاتل اشعار موجود ہیں، اتنے ان کی غزلوں سے اخذ نہیں کیے جاسکتے۔(ص ۹۵)

پروفیسر عبدالشکور احسن کے خیال میں اقبال نے رومی کے کلام کو اس طرح اپنے مزاج میں سمو لیا ہے کہ رومی کا طرزِ اظہار' بعض اوقات اقبال کے اظہارِ بیان کا جزو بن جاتا ہے۔۴۳

محمد منور نے اقبال اور رومی کی غزلوں کا باہم موازنہ کیا ہے۔ان کی روشنی میں پروفیسر محمد منور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا روم کے آہنگ میں کہے جانے والے اشعار اور غزلیں بارہا مولانا روم کے شعروں اور غزلوں سے بلند ہو گئے ہیں۔مگر تھوڑی سی تعداد مولانا کی غزلوں کی بھی زوردار ہے۔(ص ۹۴)

❑ علامہ اقبال اور خواجہ امیر خسرو دہلوی

امیر خسرو برعظیم کی فارسی نثر و نظم کے اساطین میں شامل ہیں۔ان کا کلام افغانستان' روس اور ایران وغیرہ میں بھی عزیز ہے۔خسرو کو فنِ موسیقی میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی موسیقیت کا احساس پایا جاتا ہے۔

خسرو نے فارسی کے علاوہ مقامی زبان میں بھی شعر کہے۔ ان اشعار کو ہم ہندی یا اردو کا قدیم نمونہ قرار دیتے ہیں۔۴۴

اقبال نے کچھ غزلیات امیر خسرو کے تتبع میں بھی کہی ہیں۔ پروفیسر محمد منور نے خسرو کی غزل سے اقبال کی غزل کا موازنہ کیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی رائے میں امیر خسرو کی غزلوں کے اشعار اور ان کی غزلیں باہم یک رنگ نہیں ہیں۔ اگر چہ ان میں موسیقیت موجود ہے' تو سوال یہ ہے کہ اقبال نے ان کا تتبع کیوں کیا؟ اس بارے میں پروفیسر عبدالشکور احسن نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے ہاں فارسی غزل کی ابتدائی سادگی' صداقت اور بے ساختگی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے لطیف جذبات کو غنایت اور موسیقی کے ساتھ سمو کر ان میں بڑی دل کشی پیدا کی ہے۔ ان کی غزل کی یہی وہ صفات ہیں جنھوں نے اقبال کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے کئی غزلیں امیر خسرو کی غزلوں کے تتبع میں کہی ہیں۔۴۵

بہر حال پروفیسر صاحب نے خسرو کی ۱۱ غزلیات کے مطلعے درج کیے ہیں جن سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ پروفیسر صاحب نے خسرو کے فن اور فکر پر بہت کم گفتگو کی ہے۔

❑ علامہ اقبال اور بابا فغانی

اقبال فکر اور فن دونوں کے شاعر تھے اور انھوں نے مشرق و مغرب کے جن جن شعرا سے بھی استفادہ کیا' ان دونوں پہلوؤں سے کیا۔ بابا فغانی تغزل اور جذبے کے شاعر تھے اور آپ کو سبکِ ہندی کے اولین سربراہوں میں شامل کیا جاتا ہے' اور آپ کی رنگینیِ ادا' نزاکت خیال' جدت طرازی اور تراکیب سازی کی داد دی جاتی ہے۔ (ص ۱۰۳)

اقبال بابا فغانی کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ اس بارے میں پروفیسر صاحب نے کہا ہے کہ ان کا سبکِ ہندی میں سرفہرست ہونا ہی بنیادی وجہ ہے۔ عبدالشکور احسن نے بھی اسے ہی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر محمد ریاض ایک اور پہلو کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔۴۶ ان کا خیال ہے کہ اقبال نے ان کے اسلوب سے دل بستگی دکھائی ہے۔ فکر میں ان کے پاس کچھ نہ تھا کہ اقبال اس کا تتبع کرتے۔ اس کے باوجود 'گل لالہ' دونوں کا ایسا پسندیدہ اعلامیہ تھا کہ شاید باید و۔ لالہ اقبال کے ہاں ایک وسیع تر علامت ہے مگر بابا فغانی کے علاوہ فارسی کا کوئی دوسرا شاعر اس ضمن میں اقبال کا پیش رو نہیں۔۴۷

اگر چہ محض 'لالہ' ہی تتبع اور مشابہت کی وجہ نہیں ہو سکتی لیکن اقبال کو لالے کے پھول سے جو انس ہے' اس کے پیش نظر، ہم اسے ایک قابلِ لحاظ وجہ قرار دے سکتے ہیں۔

پروفیسر محمد منور نے فغانی کی ایک غزل کے مقابل میں اقبال کی غزل رکھ کر اقبال کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے کہ اقبال نے روایت کی پابندی تو کی' مگر اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے' نیز اقبال نے اسی غزل کی زمین میں ملّی تقاضوں کو جس طرح غزل کا مضمون بنالیا ہے' وہ بھی اقبال کی خاص الخاص بات ہے۔ (ص ۱۰۵)

❑ علامہ اقبال اور عُرفی

عرفی کا نام فارسی شاعروں میں ایک فکری شاعر کے طور پر نمایاں ہے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں علامہ اقبال فارسی غزل کا نقطۂ کمال ایک طرح سے عرفی و نظیری کو جانتے ہیں۔ (ص ۱۰۹) اقبال نے دیگر مقامات پر حافظ شیرازی اور عرفی شیرازی کے درمیان موازنہ بھی کیا ہے۔ اگر چہ دونوں کا تعلق شیراز سے ہے' مگر حافظ میں جادو بیانی اور عرفی کی آتش بازی اقبال کو پسند تھی۔ مگر حافظ میں ہمتِ مردانہ کی کمی

اقبال کو ناگوار تھی جبکہ عرفی کی توانائی اور بلند حوصلگی' اقبال کی فکر کے نہایت قریب ہے ۔۴۸ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ عرفی کی خودنگہ داری' بے نیازانہ ترنگ اور جفاطلبی کے سبب وہ اقبال سے قریب تر نظر آتے ہیں ۔(ص ۱۰۹)

ڈاکٹر عبدالشکور احسن کہتے ہیں:

خودی اقبال کے فلسفے کا مرکز ومحور ہے ۔عرفی کے ہاں خودشناسی' ذوق عمل اور عظمتِ آدم کے مضامین ملتے ہیں جو اقبال کے فلسفے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔فکر ونظر کی یہ ہم آہنگی عرفی کو اقبال کا منظورِ نظر بنادیتی ہے ۔۴۹

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی پروفیسر محمد منور کے ہم نوا ہیں ۔ان کے خیال میں اقبال نے عرفی کو حافظ پر اس لیے ترجیح دی تھی کہ اس کے یہاں جوش اور توانائی کا اظہار ہے ۔۵۰

❑ علامہ اقبال اور ابو المعانی مرزا عبدالقادر بیدل

بیدل اپنی شاعری کی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے سبکِ ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں ۔ان کا مزاج عارفانہ اور فلسفیانہ تھا ۔۵۱ مرزا بیدل سے علامہ اقبال کو جو دلچسپی تھی' اس کی جھلک ان کے اولین دورِ شاعری میں بھی نظر آتی ہے ۔(ص ۱۱۵)

علامہ اقبال کو بیدل کی بعض تراکیب غیر معمولی مبہم ہونے کی بنا پر اگرچہ پسند نہ تھیں' مگر مجموعی حیثیت سے وہ مدت العمر بیدل کے فکر وفن کے مداح رہے ۔پروفیسر حمید احمد خاں کہتے ہیں:

زیادہ قابلِ توجہ وہ نامعلوم مگر دوررس اثرات ہیں' جنھوں نے اقبال کی شخصیت کے ساتھ ترکیب پا کر بالآخر اس کے شاعرانہ خیالات وعقائد کو زندہ اور متحرک کیا' اقبال کے اساسی تصورات میں سے اس کے تصورِ حرکت کو لیجیے یا ضمنی مضامین میں بہشت

کے متعلق اس کے خیالات کو دیکھیے' اور پھر بیدل کے کلام کا مطالعہ کیجیے' تو بیدل کو اقبال کے ایک ہم جنس اور ہم خیال کی حیثیت سے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ۵۲۔

پروفیسر محمد منور نے اقبال اور بیدل کی ایک غزل میں موجود فنی یگانگت کے ساتھ ساتھ رویے اور نقطۂ نظر کی مماثلت کو بھی بیان کیا ہے۔ گویا پروفیسر صاحب کے خیال میں بھی بیدل اور اقبال کے درمیان بُعد نہ تھا بلکہ ہم آہنگی موجود تھی۔

❑ علامہ اقبال اور مرزا غالب:

شذراتِ فکر اقبال میں اقبال کہتے ہیں:

بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں۔۵۳

اقبال نے غالب کا ذکر بانگِ درا کی ایک ابتدائی نظم میں کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اردو اور فارسی کے اس عظیم شاعر کے حسنِ تخیل اور لطفِ گویائی کو نا قابلِ تقلید قرار دیا ہے۔ پھر انھوں نے غالب کو جاوید نامہ میں منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ کے ساتھ فلکِ مشتری پر دکھایا ہے۔

اقبال نے غالب کے اس تذکرے سے یہ تاثر دیا ہے کہ غالب ایک تہذیب کا بندہ اور عظیم فکری و ادبی روایت کا وارث و ترجمان' بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا۔ جس کے بعد جہاں آباد یعنی بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے۔ گویا اقبال کی نظر میں ایک وہ شخص تھا جو ان سے پہلے اپنے راستوں اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا' جس کی نشان دہی بعد میں انھوں نے کی۔ اقبال نے جن اقدار و رجحانات کی نمایندگی کی' غالب کے ہاں بھی ان میں سے بعض نمایاں رجحانات و اقدار پائے جاتے ہیں مگر یہ

کہ اقبال کی سب اقدار، روایات اور خصائص غالب کے ہاں موجود ہیں، درست نہیں ہے۔۵۴

پروفیسر محمد منور نے زیرِ نظر مضمون میں غالب کی ان غزلیات کے مطلعے درج کیے ہیں' جن پر اقبال نے طبع آزمائی کی ہے۔ان سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری کی منزلِ اوّل قرار دیا جا سکتا ہے مگر ساتھ ساتھ اقبال کا تصور خودی اور عقل و دل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دینا' اپنا اثر دکھاتا ہے۔(ص۱۲۴)پھر بھی ان کے ادبی ارتقا کے بعض پہلو مثلاً اردو سے زیادہ فارسی اور اپنے افکار کے لیے نئے اسالیب اور تراکیب کی اختراع بھی ان کی ذہنی وحدت کا پتا دیتے ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمودِ سحر کو طلوعِ آفتاب سے ہوتی ہے۔۵۶ لیکن عبدالشکور احسن کا نقطۂ نظر قدرے مختلف ہے ۔وہ کہتے ہیں:

غالب کے شعور آگہی' ژرف نگاہی' نفسیاتی بصیرت' بے باکی اور صداقت نے بلا شبہہ اقبال کو بہت متاثر کیا۔مگر وہ غالب کے افکار و معانی کے مداح ہونے کے باوجود مرزا کے اسلوبِ نثر سے متاثر نہیں ہوئے۔غالب نے سبکِ ہندی کو اپنایا..... اقبال سبکِ ہندی سے قطعاً مرعوب نہیں ہیں۔۵۷

❑ علامہ اقبال اور مولانا عراقی

عراقی ہمدانی ممتاز شاعر ہیں۔عراقی کی بعض غزلیں ان کے نامور معاصرین' رومی و سعدی کی غزلوں کے پائے کی ہیں۔عراقی کا مولد ہمدان ہے۔۵۷

زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے عراقی ہمدانی کی ایک غزل کا مطلع درج کر کے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایسی ساحر و جاذب غزل اقبال کو متوجہ اور متاثر نہ

کرتی ۔لہٰذا اقبال نے عراقی کی اس غزل کی زمین میں بھی غزل کہی ہے ۔(ص ۱۲۷) اس کے علاوہ عراقی اور اقبال کے مابین فکری و فنی روابط' مماثلت یا عدم مشابہت' کسی پہلو پر زیرِ نظر مضمون میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

❑ علامہ اقبال کی انفرادیت

فارسی گو شعراسے اقبال کا موازنہ کرنے کے بعد' قدرتی طور پر اقبال کے ہاں کچھ نہ کچھ نقوش اوران کی انفرادیت سامنے آتی ہے ۔پروفیسر محمد منور نے اس مضمون میں اقبال کی انفرادیت کے اسباب پر مجموعی بحث کی ہے ۔وہ معترف ہیں کہ اگر چہ یہ جائزہ سرسری تھا' پھر بھی ہم اس جائزے کے ذریعے اقبال کے مقام کو سمجھ سکتے ہیں ۔(ص ۱۳۰)

اقبال کے مقام کے تعین سے پہلے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ ایک عظیم شاعر کے لیے قدیم شعرا کے اشعار پر تضمین کرنا کیوں ضروری تھا؟ اس سادہ سے سوال پر پروفیسر صاحب نے کوئی لمبی اورواضح گفتگو نہیں کی ۔غالباً اس لیے کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کر چکے ہیں کہ اقبال کا مقام دوسروں سے خوشہ چینی کے باوجود بلند ہے اور ایسی خاصیت مقلّدِ محض کی نہیں ہوسکتی ۔علامہ کو جہاں کہیں کسی شاعر کے ہاں کوئی گران قدر اور بلند خیال ملتا ہے' اسے فوراً اپنے کلام میں سمونے اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' یہ روش ان کے کلام میں اسرارِ خودی اور بانگِ درا کے زمانے سے لے کر ارمغانِ حجاز تک برقرار رہی ہے ۔

علاوہ ازیں اگر علامہ اقبال کے اپنے افکار کو دیکھا اور سمجھا جائے تو فارسی سے آپ کا غیر معمولی شغف بھی اس توجہ اور تتبع کا ایک سبب تھا ۔اقبال کو فارسی سے جو دلچسپی تھی اس کا اظہار ان کے خطوط اور یادداشتوں سے بھی ہوتا ہے ۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیوں کر آ گئی' جبکہ اس نے سکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی ۔انھیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔۵۸

نیز آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ فارسی میں میرے خیالات زیادہ اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں اور فارسی دنیا کے بہت سے حصوں میں سمجھی جاتی ہے۔ایک اور جگہ فارسی میں شعر کہنے کا سبب اس طرح بیان کرتے ہیں:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
درخورد با فطرتِ اندیشہ ام۵۹

اور جب بھی آپ نے فارسی میں شعر گوئی کا رجحان محسوس کیا تو یہ ایک فطری اور لازمی بات تھی کہ آپ فارسی کلاسیکی شعرا کے کلام سے فائدہ اٹھاتے اور پھر اقبال کا تو اصول ہی یہ تھا کہ ہر اس خیال سے فائدہ اٹھایا جائے جس میں زندگی کی لہر ہو۔ کیونکہ اس سے تخلیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور خودداری' خود شناسی اور بے نیازی کا احساس پرورش پاتا ہے۔۶۰

اب یہ بات کہ فارسی کے کلاسیکی اور جدید شعرا کے ہجوم میں ایک غیر فارسی شاعر کس طرح اور کیونکر اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔اس کی کچھ وجوہ پروفیسر محمد منور نے پیش کی ہیں۔

سب سے پہلے تو اقبال ان فارسی شاعروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔منور

صاحب لکھتے ہیں:

کہیں علامہ اقبال کے مطلعے اونچے رہے اور کہیں دوسرے بزرگوں کے۔ مگر ہم آہنگی کا عالم یہ رہا کہ بارہا علامہ اقبال کا مطلع نظیری یا حافظ یا مولانا روم یا خسرو کا مطلع بھی ہوسکتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ فرق نمایاں نہ تھا۔ (ص ۱۲۹، ۱۳۰)

اور ایک غیر اہلِ زبان کے لیے یہ امر فخر کا موجب بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ علامہ اقبال کے بہت سے اشعار فرداً فرداً کلاسیکی فارسی غزل کے 'حسین' 'اوسط' کا حصہ ہیں، لیکن بالعموم جب ساری غزل دیکھیں تو صاف پتا چلتا ہے کہ یہ علامہ اقبال کی ملکیت ہے۔ (ص ۱۳۰)

اقبال ان فارسی شعرائے عظام میں کس وجہ سے نمایاں نظر آتے ہیں؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی فکر کو پیش کرنے کے لیے پرانے الفاظ کو نئے معانی دیے ہیں۔ اور یوں ان کی غزل کلاسیکی غزل کے زیر اثر ہونے کے باوجود نئی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے بہت سے اشعار کسی بھی دوسرے فارسی شاعر کے کلام میں ضم ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ دوسرا سبب پروفیسر محمد منور کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے دورِ حاضر کے مسائل کو، قدیم انداز و اصطلاحات میں بخوبی سمو دیا ہے۔ آپ کے کلام میں پرانے پن کی بجائے نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے علامہ نے فارسی دامنِ غزل کے امکانات کو بھی نہایت وسیع کر دیا ہے۔ (ص ۱۳۳۔ ۱۳۴)

مضمون کے آخر میں پروفیسر محمد منور نے ۱۶۲ اشعار اور رباعیات درج کی ہیں تا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ اقبال کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہ اشعار فارسی ہونے کے باوجود 'اقبالی ہیں اور صرف اقبالی'۔ (ص ۱۳۴)

پروفیسر صاحب کے مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ پہلو پیش نظر رہنا چاہیے کہ انھوں نے

اقبال کی انفرادیت کو محض زورِ کلام یا محققین و ناقدین کی آرا سے ثابت کرنے کی بجائے براہ راست اقبال کے کلام فارسی کے نمونوں کے ذریعے نمایاں کیا ہے تا کہ قارئین از خود بھی شعرِ اقبال کو براہِ راست سمجھ کر اس کا مقام متعین کر سکیں۔ یہ پروفیسر صاحب کی ایک دلی تمنا بھی ہے۔آپ اس کتاب میں ایک جگہ اس خلش کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کے کلامِ فارسی کی معنویت کو جاننے اور سمجھنے والے اب ہمیں نہیں ملتے۔(ص ۱۴۹) ان کی خواہش ہے کہ اب ایسے لوگ سامنے آنے چاہییں۔

سبکِ اقبال

اقبال کے ذہنی اور فکری ماخذات کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔مفکرین شعرا' صوفیہ' مفسرین اور مورخین کے خیالات اور افکار سے خوشہ چینی اور استفادے کی مثالیں ان کے کلام اور نظامِ فکر میں جا بجا موجود ہیں۔۶۲ پروفیسر مرزا محمد منور اس پر ایک اور نکتے کا اضافہ کرتے ہیں کہ ان پر کسی خاص طرح کے سبک کا رنگ نہیں ہے۔البتہ یہ سارے رنگ مل جل کر'سبکِ اقبال' بن جاتے ہیں۔اقبال نہ سبکِ ہندی میں سماتے ہیں' نہ سبکِ خراسانی میں اور نہ سبکِ عراقی میں۔(ص ۱۴۸) مرزا صاحب کے اس دعوے کو ڈاکٹر حسین خطیبی کی رائے کی تائید بھی حاصل ہے۔خطیبی لکھتے ہیں:

ایں شاعر سبکی مخصوصِ بہ خود داشت کہ شاید مناسب باشد' آن را بہ نام شاعر سبکِ اقبال بخوانیم۔۶۳

سبکِ اقبال سے واقفیت کے لیے صرف زبان دانی میں مہارت کافی نہیں ہے۔بلکہ خود اپنے پاس بھی کچھ فکری و معنوی ذخیرہ ہونا ازبس لازم ہے۔اور موجودہ زمانے

کے صاحبِ علم افراد بھی جب اس علمی ذخیرے سے بے بہرہ ہوتے ہیں تو کلام اقبال کا فارسی حصہ تو ایک طرف رہا' اردو کلام کی گہرائی میں بھی کم ہی اترتے ہیں۔ اس دقت کا حل صرف علم ہے' نہ کہ محض 'مادری زبان' پہ ناز۔ (ص ۱۴۹)

سبکِ اقبال میں سب سے پہلی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اسی زبان اور لہجے میں نئے مطالب' نئے نکات اور نئے نظریات قلم بند کیے ہیں' جن سے پہلے کوئی بھی واقف نہ تھا اور غزلوں میں اپنا سوزِ دل شامل کر دیا۔ جوں جوں یہ سوزِ دروں بڑھتا گیا، اسی قدر غزلیات میں نکھار آتا گیا۔ بلاشبہ بحریں وہی مروجہ قدیم انداز کی ہیں مگر بے حد مختلف ہیں۔ اپنی اس دلیل کی تائید میں مرزا منور صاحب نے غزلیاتِ اقبال سے ایسے اشعار منتخب کیے ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ فن اور مضامینِ فکر کی ہم آہنگی ہر غزل میں موجود ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ آخر وہ کیا عوامل تھے جنھوں نے اقبال سے ان نئے مضامین کے شعر کہلوائے' اور کون سے نظریات کی وضاحت پر آپ کو اصرار تھا۔ اس کے پس منظر میں اقبال کے وہ خاص مقاصد تھے جس کی نہج پر آپ چلنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ فن برائے فن کے قائل کبھی نہ ہوئے۔ دوسرے یہ کہ ایک مختصر نظریۂ کائنات اور نظریۂ حیات رکھنے والا شاعر کائنات کے مختلف تناظر اور مظاہر میں اپنی تائید کے لیے جابجا گوناگوں عناصر کو جلوہ گر پاتا ہے اور انھیں کسی ایک اصول کے توسط سے مربوط کرتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پوشیدہ عناصر کی کھوج میں بھی سرگرداں رہتا ہے۔ اسی ذوقِ جستجو کے باعث یکسوئی پیدا ہوتی ہے اور شاہین کا اندازِ فقر پسند آنے لگتا ہے۔ (ص ۱۶۴'۱۶۵)

شاعری سے ان کا مقصود محض دادطلبی نہ تھا' بلکہ وہ اپنے نظریات کی تشریح اس انداز سے کرتے کہ ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوتے۔ اسی لیے اقبال نے فارسی اشارات'

تلمیحات کو بھی بخوبی استعمال تو کیا' مگر ان کو بھی اپنی ضرورت کے مطابق نئی معنویت عطا کی اور اس طرح فارسی غزل کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔(ص ۱۷۲)

دراصل مرزا محمد منور صاحب نے کتاب میں اس مقالے سے ماقبل عنوانات کے تحت قاری کو پہلے ہی سے ذہنی طور پر ہر شاعر سے موازنے کے بعد اس امر کے لیے تیار کیا تھا کہ اقبال کی انفرادیت ہر حال میں باقی ہے۔مرزا صاحب کی اس رائے کو عبدالشکور احسن کے حسبِ ذیل بیان سے تقویت ملتی ہے:

اقبال کی شاعری کا پورا اسلوب اس کی روح اور اس کا مزاج سبکِ ہندی سے دور ہے ۶۳۔

ایسی ہی بات ڈاکٹر محمد ریاض نے بھی کہی ہے کہ اقبال نے اردو فارسی غزل کو پہلے سے کہیں زیادہ وسعت بخشی ہے..... اقبال' رودکی' نظامی' سعدی اور حافظ شیرازی کی مانند ایک خاص سبکِ شاعری کے بانی ہیں اور ایک غیر فارسی زبان کے شاعر کے لیے یہ کوئی کم افتخار نہیں ہے۔۶۴

❑ اقبال کی فارسی غزل: مجموعی جائزہ

پروفیسر محمد منور نے اس کتاب میں دیگر فارسی شعرا کے ساتھ حضرتِ علامہ کے کلام کا موازنہ کم کیا ہے اور یہ شماریات پیش کرنے کی کوشش زیادہ کی ہے کہ حضرت علامہ نے کس شاعر کے تتبع میں تقریباً کتنی غزلیں کہیں۔(ص ۲۷'۲۸)

پروفیسر صاحب نے فارسی غزل کے ۹ شعرا سے اقبال کا موازنہ کیا ہے۔جیسا کہ انھوں نے دیباچے میں بتایا ہے کہ اس تقابلی مطالعے سے قاری کو پہلے سے طے شدہ کسی نتیجے پر پہنچانا ہرگز پیشِ نظر نہ تھا' بلکہ اپنی دلائل کے زور سے جس طرح کا نتیجہ

نکلا، اسے جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے۔ (ص ۲۸) مرزا صاحب نے اپنے مطالعے سے اقبال کی فارسی شاعری کی چند خصوصیات اخذ کی ہیں:

۱۔ اقبال کے مطالعۂ فارسی میں بہت وسعت تھی اور فارسی غزل کا اثر ان کے دل و دماغ میں راسخ تھا۔

۲۔ اقبال کی فارسی غزل کو فارسی کے تین معروف مشخص سبکوں (اسلوبوں) میں سے کسی کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی غزل خود اپنی ذات میں ایک سبک ہے' سبکِ اقبال۔ (ص ۲۸)

۳۔ اقبال کی فارسی غزل اس امر پر گواہ ہے کہ اقبال کا مقام جملہ فارسی شعرا میں بھی نمایاں اور منفرد ہے۔

بہر حال مرزا صاحب نے اس موضوع پر یہ جامع اور مختصر مقالہ تحریر کر کے اقبال کی ایک اہم جہت کو متعارف کروایا ہے' اور جیسا کہ شبلی صاحب نے کہا ہے کہ یہ کام نہ تو محض عقیدت کے بل پر انجام دیا جا سکتا ہے اور نہ محض علمیت کی بنیاد پر۔ اقبال شناسی کے لیے ایسے ظرف و ذہن کی صلاحیت بہت کم اشخاص کو ودیعت ہوتی ہے۔ (ص ۹)

اقبال اور دیگر فارسی شعرا کے موازنے کے لیے مرزا صاحب نے اشعار کے حوالے دیے ہیں اور اس کے لیے ان شعرا کے ضخیم دیوان کھنگالنا اور ایسی ہم طرح غزلوں کا سراغ لگانا ایک محنت طلب کام ہے' بلکہ شبلی صاحب کے بقول:

فارسی شاعری کے بحرِ بیکراں میں اس تقابلی مطالعے کا مواد نکالنا آسان بات نہیں۔ ان دواوین میں ڈوبنا آسان ہے مگر ڈوب کر ابھرنا خاصا محال ہے۔ (ص ۱۶)

اس ذیل میں مرزا صاحب کی یہ تحقیق توجہ طلب ہے کہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز انگلستان روانگی سے پہلے ہی ہو چکا تھا' اور اس کے لیے منور صاحب نے

مستند حوالے دیے ہیں۔اس سے سر عبدالقادر کے بیان کی تردید ہوتی ہے کہ اقبال نے فارسی شاعری کا آغاز انگلستان جا کر کیا۔

اس کتاب کے مطالعے سے مرزا صاحب کے وسعتِ مطالعہ‘ قدرتِ تحریر‘ قوتِ استدلال اور حضرتِ علامہ اقبال کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔آپ نے اقبال اور فارسی شعرا کے مابین موازنے کے لیے جو مثالیں دی ہیں‘ان کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔یہ آپ کے وسیع مطالعے‘دقتِ نظر اور محنت و کاوش کا بین ثبوت ہے۔مزید برآں یہ فارسی کے دوسرے کئی نامور غزل گو شعرا کے منتخب اشعار کا اچھا خاصا مجموعہ بھی ہے۔یہ انتخاب مرزا صاحب کی خوش ذوقی اور خوش فکری کا آئینہ دار ہے۔(ص ۱۷‘۱۸)

زیر نظر کتاب کی تصنیف و تالیف کے دو بنیادی اسباب ہیں:ایک تو خود مرزا صاحب کا حضرتِ علامہ سے لگاؤ‘اور دوسرا یہ احساس کہ اقبال کا فارسی کلام نظر انداز ہو رہا ہے۔لکھتے ہیں:

نئے ادیب پس منظر سے کٹ کر اور اصطلاح و اشارہ اور تلمیح و مجاز کی تعبیراتِ گونا گوں سے ناواقف ہونے کے باعث علامہ اقبال کے اردو کلام کو بھی فقط سونگھ سکتے ہیں اور پھر داد کے طور پر ناک سکیڑ سکتے ہیں۔چنانچہ ان کی نظر میں علامہ اقبال مشکل پسند‘تضاد کا شکار‘قدامت پسند اور نہ جانے کیا کیا ہو کر رہ گئے ہیں۔یہ ہمت کس میں اور اس محنت کے لیے فرصت کس کے پاس کہ ان کے علمی سرچشموں تک پہنچیں اور حقائق و مسائل‘اور عقائد و نظریات کی مہم تک رسائی حاصل کریں۔جہاں سے علامہ اقبال نے فیض اور اثر حاصل کیا‘آج کا سہولت پسند نقاد اور ادیب خود بلند ہو کر کسی عالی پایہ صاحبِ فکر و نظر اور صاحبِ کمالِ فن تک نہیں پہنچنا چاہتا۔وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اوپر والوں کو اپنی نچلی سطح پر کھینچ لائے۔(ص ۱۴۹)

یہ اقبال سے خالص محبت اور ان کی فکر سے گہرے شغف کی دلیل ہے۔

اگرچہ اس موضوع پر دیگر نقاد حضرات نے بھی قلم اٹھایا ہے، مگر اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ پروفیسر محمد منور صاحب نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اقبال اور فارسی شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے 'سبکِ اقبال' کو دریافت کیا ہے۔(ص ۱۴۷، ۱۴۸) نیز اقبال اور فارسی غزل کے ماضی و مستقبل کے مابین ایک نئے رشتے اور تعلق کی نشان دہی بھی کی ہے۔ پروفیسر محمد صدیق خاں شبلی کہتے ہیں:

اقبال کی فارسی غزل کوئی نیا موضوع نہیں، لیکن مرزا صاحب نے اس میں کیسے کیسے نکات پیدا کیے ہیں اور پھر جس جامعیت کے ساتھ اس موضوع کا حق ادا کیا ہے اس کی مثالیں شاذ ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک تسلی بخش کوشش کا درجہ رکھتی ہے۔ (ص ۱۸)

برہانِ اقبال

آٹھ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار نومبر ۱۹۸۲ء میں اقبال اکادمی پاکستان' لاہور سے شائع ہوا۔ یہ پروفیسر صاحب کی اردو کی چوتھی اور مجموعی طور پر پانچویں کتاب ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے تمام مضامین پر جستہ جستہ اظہار خیال کرتے ہوئے مضامین کے اہم نکات اپنے الفاظ میں بیان کیے ہیں۔ ''موجودہ مقالات کے مطالعے سے واضح ہو گیا کہ محترم نے تمام ضروری مآخذوں سے استفادہ کیا ہے اور حتی الامکان کوئی اہم چیز فروگذاشت نہیں کی۔'' (ص ۱) اور یہ کہ پروفیسر محمد منور صاحب ''جانتے ہیں کہ ان کے موضوع کے لیے کون سے مصادر اور منابع ضروری ہیں اور کن سے

اجتناب لازمی ہے۔ان کی نظر نہ صرف وسیع ہے' بلکہ حقیقت آشنا بھی ہے۔'' (ص
ا)

پروفیسر محمد منور نے زیرِ نظر تحقیقی و تنقیدی مقالات جس خوبی و عمدگی اور دل جمعی سے لکھے ہیں' اس کے متعلق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

پروفیسر صاحب کو اللہ پاک نے 'آہِ سحر' اور نورِ بصیرت' دونوں سے نوازا ہے۔اس لیے وہ صحیح مسلمان فاضل کی طرح اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ حاصلِ مطالعہ کو پیش کرتے ہیں۔اقبال کو قرآن سے شغف تھا۔وہ بغیر اس کے ایک قدم چلنا بھی گناہ سمجھتے تھے' پروفیسر صاحب کو ان دونوں سے شغف ہے۔ (ص i,ii)

ذیل میں برہانِ اقبال کے مقالات کا ایک تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

❑ قرآنی تصورِ تاریخ اور علامہ اقبال

علامہ اقبال کے مطابق تاریخ 'اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے اور روحِ انسانی کا کوئی الگ ماحول نہیں' بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے۔لہٰذا ''امم انسانی کا مطالعہ بھی ہمیں بطور اجسامِ نامیہ، علمی نہج پر کرنا چاہیے۔'' ۶۵ تا کہ تاریخ اور انسانی زندگی باہم مربوط ہو۔پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ کو ماضی' حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹنا دانش مندی نہیں ہے اور نہ اس میں زمانی اور دوری تخصیص مناسب ہے۔

محمد منور صاحب اقبال کے اس خیال کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ایک بچہ جب لڑکپن کی عمر کو پہنچا' جب بھی وہ اصلاً وہی وجود تھا' جس نے جنم لیا تھا' پھر جب وہ بھرپور جوانی سے سرمایہ دار ہوا' تو جب بھی وہ اصلاً وہی تھا' اس میں بچہ بھی شامل تھا

اور لڑکا بھی۔ یہی حال اقوام و ملل کا ہے بلکہ اجتماعاً پوری اولادِ آدم کا ہے۔ (ص ۱۴)

اس مثال سے فکرِ اقبال کی تاریخی تعبیر کی بخوبی وضاحت ہو گئی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر تاریخ کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، مختلف مفکرین مثلاً تقی الدین مقریزی، البدر حسین الاھدل اور مسکویہ کی آرا بھی نقل کی ہیں اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان مسلمان مورخین کے نزدیک علمِ تاریخ محض کہانی نہیں ہے، جس سے وقتی دل بہلاوے کا کام لیا جائے، بلکہ یہ قوموں کے اخلاق و کردار کی کہانی ہے اور ان کے عقل و دانش اور فضل و کمال کا نتیجہ ہے اور اس تاریخ کو بنانے کے ذمہ دار بھی تنِ تنہا بادشاہِ سلطنت نہیں ہوتے۔ یہاں وہ اقبال کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ: ''تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے، جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔''

لہٰذا قوموں کے اعمال سے لے کر افکار و نظریات تک، ان کی قومی جہت متعین کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کا خیال یہ ہے کہ ابنِ خلدون نے جس تاریخی بصیرت کا ثبوت تاریخ لکھ کر دیا ہے، اس کا اصل سرچشمہ قرآن ہے۔

اقبال تاریخ کو جس زاویے سے پرکھتے ہیں، پروفیسر صاحب نے اس کی دو تعبیریں کی ہیں، ایک تو یہ کہ اقبال نے 'حرکت اور جدوجہد' کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ علمِ تاریخ کی مندرجہ بالا اہمیت کے سبب ہے۔ تاریخ کا حصہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ کاوش کی جائے کیونکہ اشہبِ زمانہ کی رفتار نہایت تیز ہے۔ دوسرے یہ کہ جملہ مخلوق میں سے آدم ہی اس قابل ہے کہ اس بے رنگ کائنات میں رنگ بھر سکے:

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ ۶۶

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو تاریخ کے اس پورے تناظر سے یوں مربوط کیا ہے' فرماتے ہیں:

اگر زمان کو ایک زندہ حقیقت کے بطور تسلیم اور قبول نہ کیا جائے تو حضرت علامہ کا فلسفہ خودی سرتاسر بے مدار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تکمیل خودی یا تکمیل انسانیت کسی بے نمو اور بے حرکت وارتقا آفاق میں بے معنی بات ہے۔(ص ۱۶)

پروفیسر صاحب نے اقبال کے اس تصورتاریخ کا ربط قرآن سے بھی جوڑا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کا یہ کل نظریہ تاریخ دراصل قرآنی آیات سے براہِ راست منسلک ہے۔ مثلاً تاریخ سے عبرت حاصل کرنا' قوموں کی بداعمالی پر سزا کا نظریہ' قوموں کی حالت سنوارنے کا انتظام وانصرام اور ماضی سے ربط وغیرہ۔ اسی طرح اس مضمون سے اقبال کے نظریۂ تاریخ کی بخوبی اور بھرپور وضاحت ہوتی ہے۔

❑ علامہ اقبال' مردِ یقین

اسلام' ایمان اور یقین' تسلیم و رضا کے مختلف مدارج ہیں۔ یقین سب سے اعلیٰ اور بہترین درجہ ہے' جس کسی کو حاصل ہو جائے اس کو اطمینانِ قلب اور استقامت کی دولت ہاتھ آ جاتی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر صاحب نے اقبال کی شخصیت کے اسی پہلو کو ان کے کلام اور افکار کی روشنی میں واضح کیا ہے اور بالآخر اقبال کو 'مرد یقین' قرار دیا ہے۔ کیونکہ اقبال کو ایمان کے ساتھ ساتھ یقین کی دولت اپنی مومنانہ بصیرت اور خلوص خاطر کے سبب حاصل تھی اور وہ مادی قوت اور مادی لذت بالفاظ دیگر تن پرستی و بندگیِ ہوس کے انجام سے واقف تھے۔

قلب کے یقین کی اعلیٰ مثال حضرت ابراہیمؑ کی ہے۔ جب انھوں نے یقینِ قلبی کی خاطر اللہ سے درخواست کی تھی' پروفیسر صاحب نے اس پورے واقعے کو بیان

کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور تاریخِ اسلام کے واقعات کی مدد سے ایمان و یقین کے معنی' تقاضے اور مختلف پہلو واضح کیے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یقین کی دولت افراد کے ساتھ ساتھ اقوام کی زندگی' ترقی اور تسلسل و استحکام کے لیے بھی لابدی اور لازمی ہے۔

اقبال نے جن حالات میں 'یقین' کا علم بلند کیا، وہ حالات نہایت مایوس کن تھے۔ ترکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا۔ برِعظیم پاک و ہند پر برطانیہ قابض تھا اور عراق' اردن' اور شام بھی انگریزوں کے تسلط میں تھے۔ ایسے حالات میں اقبال نے 'خضرِ راہ' میں ملت کے زوال و انحطاط کی آواز بلند کی مگر ساتھ ہی نئے دور کی نوید بھی سنائی۔ مسلمانوں کی صفیں درست کرنے کی تلقین بھی کی اور ان کی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی۔ مصنف، اقبال کی اس جرأت آموز آواز کے بارے میں کہتے ہیں:

عام مسلمان ممکن ہے اس اندازِ نظر کو محض علامہ کی شاعرانہ تمنا اندیشی پر محمول کرتے ہوں' مگر علامہ تھے کہ پر یقین' پر امید' ہزاروں گمانوں کی یورش کے باوصف محکم الایمان تھے اور خوش آیند مستقبل کی خبر دیے جا رہے تھے۔(ص ۴۲)

اقبال کی یہ بایقین کیفیت دراصل ان کی دلی کیفیت کا نتیجہ تھی اور اس دل کو خدا پر یقین کا وہ درجہ حاصل تھا جو منطق یا فلسفے کے اصولوں اور فارمولوں کی رو سے سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اقبال کی یہ کیفیت دیکھ کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کے مطالب ان کے دل پر براہ راست وحی ہوتے تھے۔

پروفیسر صاحب نے بتایا ہے کہ مغرب کے بارے میں اقبال کے اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ آپ نے یورپی تہذیب' یورپی طرزِ تعلیم اور یورپ کے اصولِ حکمت و فلسفہ اور معاشی و معاشرتی آداب کو مسلمانوں کی تہذیب کے لیے خطرناک اور دشمن تہذیب جانا۔ ان کے نزدیک یورپی کمالات کو مسلمانوں کے دل کی ایمانی و یقینی کیفیات کے

لیے سمِ قاتل کا درجہ رکھتی تھی۔

آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ قلبی ایقان کے یہ مدارج ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوتے' بلکہ یہ دیدۂ بینا اور بابصیرت شخص ہی کا نصیب ہے۔

❑ قرآنِ حکیم کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال

علامہ اقبال' قرآن کے فلسفہ ہائے حیات سے بہت متاثر ہیں اور ان کے کلام میں جابجا اس کے حوالے ملتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے اقبال کی فکر کو قرآن کی تعلیمی جہت کے حوالے سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کے نزدیک از روے قرآن علم کے تین ماخذ ہیں: پہلا ماخذ مطالعہ کائنات ہے۔ یہ تمام کائنات علمی و سائنسی حقائق کے حصول کا ایک نہایت اہم عنوان ہے اور اس کے لیے وحی سے حاصل شدہ تمام علم، سائنسی ترقی سے بالاتر ہے، مگر صرف ان کے لیے' جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی' ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں ۶۷

پروفیسر محمد منور نے اسی بات سے ایک نہایت اہم نکتہ اخذ کیا ہے کہ مطالعۂ کائنات میں اس اہم حقیقت (ایمان) کو نظر انداز کر دینے سے معجزے اور ساحری میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے حضرت عیسیٰؑ کے چار معجزوں کا حوالہ دے کر کہا ہے:

حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کو ان کے معاصر اہلِ علم اور خصوصاً اہلِ طب ہی سمجھ سکتے تھے' وہی جانتے تھے کہ علمِ طب کہاں ختم ہوتا ہے اور معجزہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ (ص ۷۵)

اسی وجہ سے فرعون کے درباری تو ساحری اور معجزے میں فرق سمجھ کر ایمان لے آئے تھے' مگر فرعون نے انکار کر دیا۔ الغرض قرآن کے اعجاز بے شمار ہیں۔ اور قلبی ایمان'

عینی مشاہدے اور تصدیق قلبی کے مراحل طے کرنے کے بعد ہی ان معجزوں کی حلاوت محسوس کی جاسکتی ہے۔ آج بھی قرآن کے اعجاز کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو کائنات کی تسخیر میں منہمک ہیں۔

اقبال کے نزدیک' قرآن نے جابجا تاریخ سے فائدہ اٹھانے اور عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔اس حوالے سے تاریخ کا مطالعہ بھی حصول علم کا ایک باب بن گیا ہے۔محمد منور نے مختلف قرآنی آیات اور فرائڈ کے حوالوں سے کہا ہے کہ سابقہ اقوام کے کارناموں اور فطری قوانین کو تسلیم نہ کرنے والوں کے انجام میں جو عبرت ہے' یہی عبرت حصولِ علم ہے۔

تیسرا اہم ماخذ مطالعۂ ذات ہے۔آدم اپنے مادی وجود کے ساتھ عقل کے جوہر سے بھی مالا مال ہے' بس اسے بروئے کار لانے کی بات ہے اور مصنف نے اس عمومی نتیجے کو فکرِ اقبال کے 'فلسفہ خودی' سے مربوط کرتے ہوئے کہا ہے کہ نباتی' حیوانی اور جبلی سطح سے بڑھتے بڑھتے صحیح معنوں میں نائب خدا بن جانا ہی سفر نامۂ خودی ہے۔ (ص ۸۴) قرآن کی پوری تعلیمی جہت کا حاصل ہے۔خودی' اور یہی دراصل توحید ہے:

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۶۸

اس 'خودی' کے بغیر انسان بھی محض خوش پوش اور خود گفتار دوپایہ ہے۔مزید یہ کہ جس معاشرے کے انسانوں کا نفس ایک خدا پر قانع نہیں ہوتا تو وہ کئی بتوں کو اپنا خدا قرار دے کر اپنی ذاتی شخصیت کو بھی کئی اکائیوں میں منقسم کر دیتے ہیں۔آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ کائنات' تاریخ اور نفسِ انسانی کا مطالعہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ خدائے تعالیٰ واحد ہستی ہے۔دوئی فساد کا باعث ہے۔اور اقبال نے خدا کے ساتھ

ساتھ ختم نبوت کی بھی یہی دلیل دی ہے' کہ چراغ ہدایت' بھی ایک ہونا چاہیے تا کہ یکسوئی برقرار رہ سکے۔اسی طرح اسلام تمام اقوامِ عالم اور تمام نوعِ انسان کے لیے شاہ کلید بن سکے گا۔

علامہ اقبال اور کتابِ زندہ

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کو'کتاب زندہ' کہا ہے۔یہ کتاب زندگی بخش بھی ہے اور روح پرور بھی۔مختلف مراحل میں یہ کس طرح زندگی کا باعث بنتی ہے؟ یہی مباحث زیرِنظر مقالے کا حصہ ہیں۔

اسلوبِ قرآنی میں جو قوت،زور اور کشش ہے'وہ قرآن کے ترجمے میں پوری طرح منعکس نہیں ہوتی۔خواہ ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو۔اس کے باوجود اس ترجمے نے گوئٹے جیسے عالم کے دل میں تاثیر کی ٹھنڈک ضرور پہنچا دی۔فلپ کے حتی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کا اسلوب نا قابلِ تقلید ہے،اسی طرح اس کا پیغام بھی انسان کی روح کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔قرآن ہر دور کے لیے ہے اور ہر نئی دنیا کے نئے امکانات سے نمٹنے کی قوت اور طاقت فراہم کرتا ہے۔مگر اس کے باوجود انسان کیوں غفلت کا شکار ہو کر اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے؟اس کا جواب مصنف نے قرآن پاک کی روشنی میں دیا ہے۔

پروفیسر محمد منور صاحب نے افکارِ اقبال کی روشنی میں متعدد قرآنی اصول دریافت کیے ہیں۔اور اس کے ساتھ قرآن اور حدیث کے حوالے بھی دیے ہیں۔حفظِ قرآن'قرآن پر عمل کرنا'قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنا'آئینِ قرآن کا عملی نفاذ اور تحفظ'قرآن سے تفقہ حاصل کرنا'قرآن کا آخری کتاب ہونا'قرآن بطور کلید حیات'قرآن کے مطابق قیاس'اجتہاد'استنباط اور اجماع کی گنجایش اور پیغامِ قرآن

کی بین الاقوامی حیثیت‘ مصنف نے ان سب نکات پر فکرِ اقبال کے تناظر میں بحث کی ہے۔اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس زندہ کتاب کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ اخروی کامیابی کی صورت میں ملے گا۔محمد منور مضمون کے آخر میں ایک فلسفیانہ سوال اٹھاتے ہیں: ’کیا حیاتِ آدم واقعی فانی و مہمل ہے؟‘(ص ۱۲۵)

یہ وہ سوال ہے جس کا سامنا ہر عام انسانی ذہن کو کرنا پڑتا ہے‘ مصنف کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ اتنی ہی پر خلش‘ یہ الجھن ہے کہ آیا آدمی مرنے کے بعد سچ مچ زندہ ہو جائے گا؟ (ص ۱۲۵) مصنف نے اس کے جواب کے ساتھ اقبال کے حسب ذیل اشعار کا حوالہ دیا ہے:

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے۶۹

محمد منور صاحب نے قرآن‘ حدیث اور اقبال کے حوالے سے درج بالا فلسفیانہ سوال کا ایک بہت ہی معنی خیز جواب ان الفاظ میں تلاش کیا ہے‘ جو پورے مضمون کا حاصل ہے کہ: ’’اگر یوں دیکھیں تو قرآن‘ کتاب زندہ‘ عالم انسانیت کی شکست آرزو کا واحد علاج ہے۔‘‘(ص ۱۲۶)

❑ علامہ اقبال،بحضورِ قرآن

قرآن اپنی فکر‘ سوچ‘ مقاصد اور پیغام لابدی کے اعتبار سے اقبال کے لیے کتابِ زندہ کا درجہ رکھتا ہے۔ پروفیسر محمد منور نے اس حوالے سے اقبال کی ایک اور فکری جہت کو پیش کیا ہے کہ قرآن اعجاز ہے‘ تو اس کے الفاظ‘ انسانوں کی روحانی دنیا کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں اور قرآن انسان کی نظری دنیا کے لیے کیونکر حبلِ متین‘

ثابت ہوسکتا ہے۔ نیز قرآن اگر دل پر نازل ہوتا رہے‘ تو اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ ہیں وہ چار مباحث جو اس مقالے میں پیش کیے گئے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مصنف نے اب قرآن کے روحانی پیغام کی بجائے ظاہری صورت اور اس کے ظاہری معجز نما ہونے کو فکرِ اقبال کی روشنی میں ثابت کیا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

آپ کے خیال میں صرف قرآن کا پیغام ہی شفا بخش نہیں‘ بلکہ یہ ہر دو لحاظ سے قوت بخش بھی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن لفظی طور پر ہی قلب محمدؐ پر نازل ہوا تھا۔ کیونکہ پیغام‘ الفاظ کے بغیر آگے منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ بالخصوص وہ پیغام جو پوری نسل انسانی کے لیے ہو اور یہ اقبال کا دوٹوک موقف ہے۔ فقیر سید وحیدالدین نے ایک واقعہ اقبال کے حوالے سے بیان کیا (جسے مصنف نے نقل کیا ہے) کہ ایک دن اقبال نے ہمیں بتایا کہ فارمن کرسچین کالج لاہور کے اجلاس کے بعد‘ کالج کے پرنسپل میرے پاس آئے اور علاحدہ لے جا کر پوچھا: تمھارے نزدیک پیغمبرؐ پر قرآن حکیم کا صرف مفہوم نازل ہوا تھا یا تم اس کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتے ہو؟ میں نے کہا میرے نزدیک تو قرآن کے الفاظ الہامی ہیں۔ یہ غیر متوقع جواب تھا۔ انھیں بہت تعجب ہوا تو اقبال نے کہا: جب مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پھر نبی آخرالزمان پر پوری عبارت کیوں نازل نہیں ہوسکتی؟

ے۰

دوسرے یہ کہ سورہ یونس کی آیت ۲ے کے مطابق قرآن شفا اور رحمت ہے۔ اس سے مصنف نے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ دراصل قرآن کے الفاظ کی معنوی تاثیر کے ساتھ ساتھ لفظی تاثیر بھی دلوں کو بدلنے کی قدرت رکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ قرآن کو سن کر ایمان لے آئے تو دراصل یہ قرآنی الفاظ کی قوت تھی‘ جس نے قلبِ عمرؓ کو بدل کر رکھ دیا:

تو می دانی کہ سوزِ قرأتِ او
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را۷۵

اس ذیل میں پروفیسر محمد منور نے کہا ہے کہ قرآنی الفاظ میں وہ مافوق الحواس نورانی قوت ہے جو صرف غیر مرئی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہ حسیات' لطافتیں اور نزاکتیں بظاہر سمجھ میں آنے والی نہیں اور نہ مادی آلائشوں کے سبب ہر عام انسان کے بس میں ہیں اور اقبال بھی اس کے قائل ہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت سے انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے۔ اگر ساری دنیا یہی سمجھ لے کہ اس کی تلاوت' اللہ سے رشتہ جوڑنے کا اہم سبب ہے تو پھر یہ تلاوت اتحادِ امت کا بلکہ اتحادِ انسانیت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یوں ان کی اجتماعی زندگی میں قرآن لائحہ عمل بن جائے گا۔

چوتھا نکتہ جس پر آپ نے گفتگو کی وہ یہ ہے کہ 'قرآن دل پر نازل ہوتے رہنا چاہیے۔' (ص ۱۴۳) ایمان صرف اقرارِ لسانی ہی نہیں' یقینِ قلبی کا نام بھی ہے۔ اس دل کو مرجع ایمان قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے وحی کے الفاظ کا دل میں بیٹھنا لازم ہے۔ بقول اقبال:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف۷۶

لیکن ایسا ضمیر کیسے تیار کیا جائے' جو قرآن کے نزول کو برداشت کر سکے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اس کے لیے قرآن پر ایمان اور قرآن سے قلبی لگاؤ ہونا لازم ہے۔ اسی طرح سے قرآن کے الفاظ کو قبول کرنے کے بعد' اس پر عمل کرنے اور اس کو زندگی میں شامل کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ان کے بقول: حضرت علامہ کی خواہش یہ تھی کہ قرآن ہر مردِ مومن کا مزاج اور اس کی فطرت بن جائے۔ یعنی 'مردِ مومن خود

اپنی ذات میں چلتا پھرتا قرآن بن جائے۔" (ص ۱۴۸) قرآن پاک کے ان بنیادی خیالات میں پختگی کی وجہ سے اقبال اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا کلام دراصل قرآنی خیالات ہی کی توضیح ہیں۔

❑ جہانِ اقبال، جہانِ قرآن

زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر محمد منور نے فکرِ اقبال کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ اس کے فکری و نظری زاویے کچھ اور وسیع اور فراخ ہو گئے ہیں۔ اقبال کے خیال میں قرآن کا پیغام آفاقی ہے۔ مگر حسبِ روایت اوراقِ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر انقلابی پیغام کا ٹکراؤ اہلِ دنیا کے نظریات سے ضرور ہوتا رہتا ہے اور اس ٹکراؤ میں اس آفاقی و انقلابی پیغام کی حقانیت ثابت ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی صورت قرآن کے تصورِ قومیت کی بھی ہے۔ قرآن رنگ و نسل اور حسب و نسب کے محدود نظریات کا ہمیشہ قاطع رہا ہے۔ اقبال نے ہجرتِ مدینہ کو اسی پہلو سے دیکھا ہے کہ یہ دراصل اسلام کے بین الاقوامی مذہب ہونے کی دلیل تھی، ورنہ حضور اکرمؐ اپنے ہی ہم نسل، ہم زبان اور ہم وطن ابوجہل و ابولہب کے وطن سے کبھی بھی ہجرت نہ فرماتے۔

پروفیسر محمد منور صاحب غزوۂ بدر کا حوالہ دے کر اقبال کی اس فکر کو مزید واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی تصورِ قومیت اور تصورِ مساوات نے اولادِ آدم کی پستی کو رفعت میں بدل دیا۔ پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ بنی آدم نے جب بھی ان نظریات کو ترک کیا تو ان کے معاشروں میں بہیمیت لوٹ آئی اور وہ مفلوک الحال اور ذہنی ژولیدگی کا شکار ہو گئے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں:

اصل فسادِ آدمیت، آدم کی آدم ناشناسی ہے۔ (ص ۱۶۰)

اقبال کے نزدیک فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے، مگر بحیثیت مجموعی یونانی مفکرین نے قرآن کی بصیرت کو محدود کر دیا، محمد منور اقبال کے اسی نکتے کی توضیح میں بتاتے ہیں کہ فلسفۂ یونان غیر متحرک ہونے کی وجہ سے انسانی زندگی کو غیر فعال کرنے کا باعث بنا۔ پھر اس نے خدا کے تصور کو محدود کر کے انسانی عقل کو غیر ضروری اہمیت دی۔ مصنف نے قرآنی آیات کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ سب یونانی افکار، قرآنی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ اسی پس منظر میں اقبال نے مغربی فکر و مذہب اور یونانی منطق و فلسفہ پر کڑی تنقید کی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے عقل کی بجائے عشق کو، مغرب کی بجائے مشرق کو، اور الحاد کی بجائے قرآن کو فائق رکھا۔ اور اپنی اس فکر کو 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں بڑے دوٹوک انداز میں پیش کیا۔ اشتراکیت اور مزدکیت سب فتنے ہیں۔ اقبال دراصل 'جہانِ قرآن' دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس جہان کا تصور انھوں نے جمال الدین افغانی کی زبانی دیا ہے، کہ یہ وہ دنیا ہے جو ابھی تک حکمِ قم کی منتظر ہے۔ وہ ایسی دنیا ہے جس میں رنگ و بو کے امتیازات نہ ہوں گے اور جس کی شام بھی صبحِ فرنگ سے روشن تر ہوگی۔ قرآن بھی ایک ایسے ہی جہان کو آباد کرنے کی دعوت و تلقین کرتا ہے اور اقبال کا پیغام ہمیں اسی جہانِ نو کی تخلیق کرنے پر آمادہ کرتا ہے یہ ہمارے لیے ناگزیر ہے:

گر تو مے خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن ۴۷

اس پوری بحث کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس مقالے کے عنوان اور مباحث میں بڑا گہرا ربط اور معنویت ہے۔

علامہ اقبال اور اجتہاد

یہ برہانِ اقبال کا آخری مقالہ ہے۔قرآن مجید محض اخلاق اور فلسفے کی کتاب نہیں' بلکہ یہ قانون اور ضابطے سے متعلق بھی گفتگو کرتی ہے۔علامہ اقبال دین کو ایک ضابطہ حیات سمجھتے ہیں' جو زندگی کے جملہ پہلوؤں کا شارح ہے۔ایسے دین کو زمانے کے نوع بہ نوع مسائل میں کس طرح زندہ وجود کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے؟ اس پر گہرے غوروفکر کی ضرورت ہے۔زیرِنظر مقالہ اسی موضوع سے بحث کرتا ہے۔ پروفیسر محمد منور نے فقہ کے معانی ومطالب بیان کرنے کے بعد اقبال کے کچھ خطوط سے اقتباسات پیش کیے ہیں' جن میں اقبال نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ اسلامی اصولِ فقہ وقانون کے بارے میں کتاب لکھنا چاہتے ہیں' مگر خرابیِ صحت اور نظر کی کمزوری اس کی اجازت نہیں دیتی جبکہ اس موضوع پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔۷۴

محمد منور صاحب نے اپنے اس مقالے میں اقبال کے چھٹے خطبے کے حوالے سے اجتہاد کی اہمیت ومدارج اور مطالب پر گفتگو کی ہے اور اجتہاد کے بارے میں اقبال کے تصورات کو بہ ترتیب بیان کیا ہے تا کہ فکرِ اقبال کے اس زاویے سے بھی قاری آگاہ ہو جائیں۔اگرچہ اقبال ایک شاعر' مفکر اور فلسفی تھے' مگر ساتھ ساتھ وہ شارحِ قرآن بھی تھے وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں سے بھی واقف تھے' اور اسلام کا بطور نظامِ حیات نفاذ بھی چاہتے تھے۔نیز خواہاں تھے کہ وہ خود بھی دینِ اسلام کی کوئی خدمت انجام دے سکیں۔۷۵

اجتہاد کے سلسلے میں قرآن پہلا اور حدیث دوسرا آئینی ماخذ ہے اور محدثین نے شریعتِ اسلامیہ کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔اجتہاد کی خاطر ایک مجلس شوریٰ یا

قانون ساز اسمبلی ہونی چاہیے کیونکہ اسی طرح سے پورا عالمِ اسلام متحد و یک رنگ ہوسکتا ہے اور نہ صرف مسلم معاشرے اسلام پر متفق ہوں گے بلکہ خود فرد کے اندر بھی یک رنگی شخصیت ابھرے گی' جو اسلام کا مطمحِ نظر ہے۔

اجتہاد کے باب میں اقبال کے خیالات کا نچوڑ پیش کرنے کے بعد، پروفیسر محمد منور نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اقبال نے اجتہاد جیسے دقیق موضوع پر بات کرتے ہوئے بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے' اور جدیدیت کی رَو میں بھی نہیں بہے، بلکہ ان کا مزاجی توازن ہر جگہ کارفرما ہے:

وہ حال سے بیزار نہ تھے' مستقبل سے مایوس نہ تھے' وہ دلوں کو سنوارنے کے لیے کوشاں رہے اور مستقبل کے بارے میں تو خاصے پر امید تھے' انھیں بھرپور یقین میسر تھا کہ اسلام ہی حق ہے۔(ص ۲۱۹)

۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کے بعد عالمِ اسلام کی حالت میں جو کچھ سدھار آیا' اس سلسلے میں مسلم ممالک کی پہلی اقتصادی کانفرنس ایک اہم کڑی ہے۔ مصنف خود بھی اتحادِ عالمِ اسلامی کے بڑے موید ہیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے بڑے پر امید ہیں کہ شاید اس صورت میں اسلامی قانون سازی کے لیے کسی 'ندوہ' کا وجود عمل میں آ سکے۔

برہانِ اقبال: مجموعی جائزہ

برہانِ اقبال' کے تمام عنوانات قرآن کے فکر اور پیغام کی تشریح ہیں۔ علامہ اقبال کو قرآن پاک سے گہرا شغف تھا اور وہ اپنے خیالات و افکار کے لیے قرآن ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس حوالے سے رسول اللہ سے بھی آپ کا عشق اور بے پایاں محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پھر اقبال کے سامنے امتِ مسلمہ کے مستقبل کا

ایک وسیع منصوبہ تھا' جس کے تحت وہ اپنے افکار کوئی شکل اور نئے انداز میں پیش کر کے ملّت کی کشتی کو کنارے تک لانا چاہتے تھے ۔اس کے لیے از خود کوئی نیا جہانِ فکر تلاش کرنے کی بجاے اقبال نے قرآن ہی کو اپنا سہارا بنایا۔

جناب محمد منور نے بھی اقبال کے انھی پہلوؤں کو اہمیت دی ہے' تا کہ طلبہ کے ذریعے سے ایک ایسی بیدار اور پر مغز قوم تیار کی جائے جو خود کو نئے دور کے فتنوں سے بچا سکے۔ یہ مرزا صاحب کا وہ پروگرام تھا' جس پر وہ بڑی خاموشی کے ساتھ عمر بھر کام کرتے رہے ہیں' اور چونکہ انھیں اللہ پاک نے آہِ سحر' اور نورِ بصیرت سے نوازا تھا، لہٰذا وہ ایک مسلمان فاضل کی طرح اقبالیات کا مطالعہ کرتے رہے اور نہایت خلوص کے ساتھ حاصلِ مطالعہ کو پیش کرتے رہے۔(ص i)

اس کتاب کے تمام مقالے نہایت عالمانہ انداز سے تحریر کیے گئے ہیں ۔موضوع کی مناسبت سے محض اقبالی نقطہ نظر ہی کو پیش نہیں کیا گیا بلکہ متعلقہ عنوان کے لغوی و اصطلاحی معانی کے علاوہ سیرت' تاریخ اور فقہ کے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی وقیع اضافے کیے گئے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ علماے دین کے نقطۂ نظر کو بھی بیان کیا گیا ہے' اور ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع پر اقبال کے خیالات کو اشعار' ان کے خطوط اور مقالات وغیرہ کے مبسوط بیان سے بھی واضح کیا ہے۔

بعض مضامین تو اس قدر جامع، ہمہ پہلو اور معلوماتی ہیں کہ اقبال کے نقطۂ نظر کے علاوہ متعلقہ موضوع پر اور بھی بہت کچھ قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ یہاں قرآن کے کسی خاص پہلو کو بہ تفصیل بیان کرنا مقصود ہے' لیکن عام طور پر آپ کے مضامین میں اقبال کے خیالات ہی کی صراحت مقصودِ نظر ہوتی ہے اور پروفیسر صاحب اس میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اقبال کے اس خیال کو دیگر مستند حوالوں سے بھی وقیع بناتے ہیں۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس مجموعۂ مقالات کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔(ص ii)

برہانِ اقبال میں پروفیسر صاحب نے اقبال اور قرآن کے افکار کا موازنہ ایک منفرد انداز سے کیا ہے۔ آپ نے تاریخ 'یقین' تعلیمی جہت اور اجتہاد کے تصورات کو بھی بالوضاحت پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نے اپنے بنیادی افکار (خودی' بے خودی وغیرہ) کے علاوہ دیگر مباحث میں بھی قرآن ہی سے خوشہ چینی کی ہے۔ فکرِ اقبال کا ہر پہلو قرآن سے ماخوذ ہے۔ مرزا صاحب کے نزدیک قرآن کریم کی روح کو سمجھنے کے لیے کلامِ اقبال شارٹ کٹ ہے۔٦ے

قرطاسِ اقبال

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۸ء میں اقبال اکادمی پاکستان' لاہور نے شائع کی۔ یہ اقبال اور فکرِ اقبال کے مختلف النوع مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ بیشتر مضامین مختلف مواقع (۲۱ اپریل اور ۹ نومبر' ۲۳ مارچ وغیرہ) پر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ مضامین مختصر ہیں۔ ۳ مضامین مصنف کے بیرونِ ملک اسفار کی مختصر رودادوں پر مشتمل ہیں۔ 'اقبال بحضور آدم' ایک طویل مقالہ ہے' جو ۱۹۸۶ء میں پنجاب یونی ورسٹی میں 'اقبال میموریل لیکچر' سیریز کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔ یہ اس سے قبل الگ کتابچے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اسے اس کتاب میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

اقبالیات پر اردو میں مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے۔ غالباً برہانِ اقبال کے بعد تمام تحریریں اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لیے یہ سابقہ مجموعوں کی نسبت زیادہ ضخیم

(۳۲۸ صفحات) ہے۔

مضامین گو کہ مختصر ہیں مگر ہر لحاظ سے اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں اور مختصر ہونے کے باوصف تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ عنوانات نوع بہ نوع ہیں۔ اقبال کی گھریلو زندگی سے لے کر شاعری' اور اقبال کے افکار و نظریات سے لے کر اقبال کے شارحین و معتقدین سے ملاقاتیں، بہت کچھ اس کتاب کی زینت ہے۔ کینوس وسیع ہے اور اس پر پھیلی ہوئی تصاویر رنگ رنگ ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ آپ کے ایک شاگرد اور نیاز مند ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے تحریر کیا ہے۔ ان کے خیال میں پروفیسر محمد منور کی شخصی خوبیوں ہی نے انھیں یہ صلاحیت بخشی کہ وہ اقبال پر اتنی جہتوں میں لکھ سکیں۔ اور پروفیسر صاحب کی یہ خوبیاں اقبال کی ذاتِ ستودہ صفات کا خاصہ بھی تھیں۔ پروفیسر صاحب محض اقبال کے قاری اور شارح ہی نہیں' ایک کھرے اور سچے پاکستانی ہیں اور پاکستان کے حالات و مسائل پر ایک صاحبِ بصیرت کی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہاشمی کہتے ہیں:

زیر نظر مضامین کی خوبی یہ ہے کہ وہ فکرِ اقبال کی بہترین ترجمانی و توضیح کے ساتھ قاری کا تعلق زندگی کے حیات افروز پہلوؤں اور زندہ مسائل سے جوڑتے ہیں۔ (ص ۴) چنانچہ قاری ایک نئے ولولے اور باطنی حرارت سے مالا مال ہوتا ہے۔ (ص ۲) ان تحریروں کی یہ حرارت دراصل پروفیسر صاحب کی ایمانی حرارت سے ماخوذ ہے کیونکہ پروفیسر صاحب افرادِ ملت کی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے باوجود' امت کے روشن مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ (ص ۳)

زیر نظر مضامین و مقالات اقبالیات میں ایک وقیع اضافہ ہیں اور یہ مرزا صاحب کی ایک بہت بڑی علمی' ملی اور قومی خدمت ہے۔ ذیل میں ان کا ایک تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

❑ حضرت علامہ کی گھریلو زندگی کے نقوش

کسی بھی شخصیت کی تصویر اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب اس کی درونِ خانہ سرگرمیاں بھی سامنے آ جائیں۔ جناب محمد منور نے زیادہ تر اقبال کے فکر اور نظریات کو واضح کیا ہے' زیرِ نظر مضمون میں فکرِ اقبال کا احاطہ مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ یہ دراصل ڈورس احمد کی Iqbal as I Knew him (اقبال اکادمی' پاکستان' لاہور) کا خلاصہ ہے۔ محترمہ ڈورس کو اقبال کے بچوں کی اتالیق رہنے کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے اقبال کی گھریلو زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا ہے' لہٰذا ان کی معلومات مستند اور مشاہدہ وقیع ہے۔

پروفیسر محمد منور کے زیرِ نظر مضمون میں محترمہ ڈورس احمد کے اس کتابچے کے اہم نکات شامل ہیں۔ مصنفہ کے مطابق علامہ کی سادگی حد درجے کی تھی۔ آپ گھر میں ہمیشہ تہ بند اور بنیان میں ملبوس رہتے تھے۔ مغربی لباس ناپسند تھا۔ جاوید منزل کے جو تین کمرے آپ کے زیرِ استعمال رہتے تھے۔ آپ ماہ بہ ماہ ان کمروں کا کرایہ جاوید اقبال کو ادا کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۳۸ء کی ۲۰ تاریخ کو بھی (یعنی وفات سے ایک روز پہلے) وہ کرایہ ادا کر چکے تھے۔ اسی طرح ڈورس نے جناح اور نہرو سے اقبال کی ملاقاتوں کا حال بھی قلم بند کیا ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اقبال کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی فکر رہتی تھی۔ ملازمین میں سے علی بخش خصوصاً آپ کا مزاج شناس تھا۔ پروفیسر محمد منور کے نزدیک محترمہ ڈورس احمد اس لیے بھی قابلِ احترام ہیں کہ:

آپ نے ہمارے پیر و مرشد کو کئی تفکرات سے چھٹکارا دلایا' خصوصاً بچوں کی تربیت کے باب میں' اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید حضرت علامہ ضربِ کلیم' پس چہ باید کرد اے اقوام

شرق اور ارمغانِ حجاز مکمل نہ کر پاتے ..... اس اعتبار سے' اے محترمہ ڈورس احمد! آپ کا احسان فقط ہم پاکستانی مسلمانوں پر ہی نہیں' بلکہ پوری امت مسلمہ پر ہے۔ (ص ۱۰)

یہ مضمون' علامہ کی شخصیت کا ایک خوب صورت تاثر پیش کرتا ہے۔

❑ علامہ اقبال، بامقصد عملی زندگی کی روشن مثال

علامہ اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے' بلکہ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ آپ نے اسلام اور قرآن ہی کی ترجمانی اور شرح کی ہے۔ آپ نے امتِ مسلمہ کے حالات کو دیکھ کر جو نتائج اخذ کیے' اور ان کی روشنی میں جو لائحۂ عمل پیش کیا' وہ دراصل آپ کے شخصی کمال اور فکری استحکام کا نتیجہ تھا۔

پروفیسر محمد منور' اقبال کی زندگی کو بالکل نئے انداز سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے لیے زندہ رہنے والے تو کروڑوں اور اربوں گزرے ہیں' مگر دوسروں کے گہرے جذبات اپنے دل میں ڈال لینے والے یعنی دوسروں کی خاطر اور معاشرے اور انسانیت کی خاطر زندہ رہنے والے کتنے لوگ ہوتے ہیں؟ (ص ۲۰) آپ کے خیال میں فرد کے تربیت یافتہ ہونے کا ایک پہلو یہ ہے کہ:

اولادِ آدم کا کوئی فرد اس وقت تک واقعی فردِ مفید کے طور پر تربیت یاب نہیں ہوتا' جب تک کہ وہ کسی معاشرے میں زندگی کے تجربات کی بھٹی میں سے نہ گزرے ......اسی طرح صبر' استقلال' بردباری' ایثار' شفقت' غیرت اور حمیت وغیرہ اوصاف معاشرتی زندگی ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں' ......تارک الدنیا شخص کوئی اخلاقی فردِ معاشرہ نہیں' لہٰذا وہ معاشرے کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ (ص ۲۱'۲۲)

اس کے لیے پروفیسر صاحب' ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اس رائے کو بطور حوالہ پیش

کرتے ہیں کہ افراد ہی وہ معین مرکز ہوتے ہیں جن کے اردگرد اجتماعی تصورات و جذبات جمع ہوتے ہیں۔(ص ۲۲)

اقبال نے بھی انفرادی طور پر تمام چیلنجوں کو قبول کیا اور آپ نے ان تمام زوردار چیلنجوں کو اس وجہ سے قبول کرلیا کہ وہ خود صحیح معنوں میں خود شناس تھے۔اپنا مقام پہچانتے تھے اور یہ تعین بھی رکھتے تھے کہ یہ کائنات آدم ہی کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ قابل اور کامیاب انسان وہ ہے جو اپنی ذات کی قوتوں کو کچھ اس طرح سے ترتیب دے کہ زمانے بھر کو متاثر کرسکے۔اقبال نے صوفیہ کی روش اختیار نہیں کی کہ محض باطنی اثرات سے خود کو محفوظ رکھا۔بلکہ آپ نے اپنی باطنی قوتوں کو اس طرح منظم کیا کہ زمانے کو فکر و عمل کی نئی جہتوں سے واقف کروایا۔اقبال کے اسی کارنامے کو مرزا صاحب نے 'بامقصد عملی زندگی کی روشن مثال' قرار دیا ہے۔یہ، ان کا اقبال کو خراجِ تحسین ہے۔

صاحبِ ادراک اقبال

علامہ اقبال کے کلام کا معتد بہ حصہ مغرب 'مغربی تہذیب' الحادی قوتوں اور مغرب کے فلسفہ و سائنس کے ساتھ تہذیب کی خرابیوں اور برائیوں کی تنقید پر مشتمل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبال کے ہاں ایسی گہری بصیرت کس طرح پیدا ہوئی؟ پروفیسر محمد منور نے اس مضمون میں اسی نکتے پر گفتگو کی ہے۔

آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ توحید اور دولتِ یقین جس شخص کے قلب میں راسخ ہو جائیں' اس کی زندگی کو معنویت و قوت حاصل ہو جاتی ہے۔(ص ۲۸)پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال نے فکرِ مغرب پر تنقید اس وقت شروع کی' جب اہلِ مشرق' مغربی فتوحات سے مسحور تھے اور اس تہذیب کی بالادستی کا نشہ ان کے

سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ علامہ نے علومِ مغرب میں سے مفید علوم کی حوصلہ افزائی بھی کی مگر آپ جھوٹے نگوں اور موتیوں کی پہچان رکھتے تھے۔ آپ صاحبِ نظر تھے' خیرو شر اور صفاو کدر کو پہچاننے کے اہل تھے اور یہ بصیرت کی دولت ان کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ ایسی گراں بہا دولت ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ بلکہ حضرت علامہ جیسا صاحبِ وجدان اور صاحبِ راز ہی ان لطائف کو اس حسن و خوبی سے بیان کرسکتا تھا۔ (ص ۴۹) گویا مرزا صاحب نے اقبال کی شخصی خوبیوں اور دولتِ یقین کو ان کی راست فکری کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

❑ وجدانِ اقبال کی فتوحات

زیرِ نظر مضمون میں پروفیسر محمد منور فکرِ اقبال کے جس پہلو پر بحث کرتے ہیں' وہ ان کے فلسفے' نظریے یا پیغام سے متعلق نہیں بلکہ یہ 'وجدانِ اقبال' کے ایسے مخفی گوشے ہیں جو عام قاری کی گرفت میں آسانی سے نہیں آتے۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ مسلم امت کی زبوں حالی کے دور میں اقبال نے اپنی طویل نظموں اور غزلیات میں امید کی جو کرن دکھائی' اور یقین کے ساتھ جس سورج کے طلوع ہونے کی خبر دی' ایک عام قاری کے نزدیک یہ سب معمول کی بات ہے۔ مگر مرزا صاحب اس کو ایک اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے کلامِ اقبال کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ پڑھا اور سمجھا ہے اور خطوط' مقالات' اور بعض گفتگوؤں کے حوالے سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اقبال کی بصیرت' ادراک کے درجے سے بڑھ کر وجدان کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ اس کے لیے پروفیسر منور، اقبال کی غزل کے اشعار:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا ۷۷

کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ۱۹۰۷ء کے یہ اشعار جن پر آپ نے باقاعدہ 'مارچ ۱۹۰۷ء' کے الفاظ رقم کیے ہیں۔کوئی معمولی بات نہیں ہے۔خود اقبال نے ۱۹۳۱ء میں یہ کہا تھا کہ میں نے پچیس سال قبل جو پیش گوئیاں کی تھیں، میں خود اس وقت ان کو سمجھ نہ سکتا تھا۔گویا یقین تو بحال تھا' مگر عین الیقین کی کیفیت بعد ہی میں نصیب ہوئی۔اسی طرح سے 'خضرِ راہ' (۱۹۲۲ء) اور 'طلوعِ اسلام' (۱۹۲۳ء) میں انھوں نے بڑی زوردار آواز کے ساتھ طلوعِ اسلام کی نوید سنائی ہے جو اس وقت بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی تھی مگر آنے والے وقت نے یہ سب سچ کر دکھایا۔اسی وجہ سے پروفیسر محمد منور صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

علامہ کا وجدان ادراک سے آگے آگے رہا۔وہ امور کا نظارہ حال کے پردے سے جھانک کر کر لیتے تھے۔ان کا حال لمحاتی اور ساعاتی نہ تھا' اس میں دور دور تک کا پھیلاؤ تھا۔(ص ۴۲)

اقبال کے اس وجدان کی ایک تعبیر قیامِ پاکستان کی صورت میں ہوئی اور دوسری تعبیر کو جس کی راہبری بھی اقبال کر گئے ہیں، ابھی پورا ہونا ہے۔اب مسلمانانِ ایشیا کے اسلامی تشخص کے تحفظ کی ذمہ داری بھی پاکستان ہی کو پوری کرنی ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال اپنی ان 'پیش گوئیوں' کے بارے میں بڑے پر اعتماد نظر آتے ہیں:

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم۷۸

❏ وحدت افکار کی اہمیت، کلام اقبال کی روشنی میں

جب افکار میں یگانگت اور وحدت ہوگی تو عمل میں یکسوئی پیدا ہوگی۔اس سے شخصیت میں ٹھہراؤ' ذہن میں روشنی اور کردار کو خود شناسی اور خود اختیاری کے حقوق ملیں گے۔فی زمانہ ملی وحدت کے لیے فکری وحدت لازم ہے۔وہ کہتے ہیں کہ

صاحبِ کردار اور مشخص اصحاب کا قحط الرجال ہے۔ پروفیسر منور کے نزدیک اقبال ایسی تعلیم سے نالاں تھے' جو کردار کو بے عملی اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کر دے اور آدمی کبھی تو ملا کی طرح قدامت پرست ہو کر رہ جائے' اور اگر اس کے برعکس راستہ اختیار کرے گا تو مغرب کی چکاچوند روشنی میں آنکھیں چندھیا جائیں اور وہ بالکل ہی بے بصر ہو جائے۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اگر زندگی میں کچھ کرنا ہے اور صرف اپنی ہی زندگی سنوارنا نہیں' بلکہ ملت کے ایک فرد کی حیثیت سے بھی زندگی میں کچھ کردار ادا کرنا ہے' تو لازم ہے کہ اپنی فکر کو توحید پر استوار کیا جائے' اسی سے افرادِ امت میں وحدت پیدا ہو گی۔

❑ خودی کا سرِّ نہاں، لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ کے کلمات جب تک زبان سے نکل کر دل میں جاگزیں نہ ہو جائیں' اس وقت تک یہ محض الفاظ ہی ہیں اور الفاظ کبھی بھی انقلاب نہیں لا سکتے۔ دل کی گواہی' اور یقین کا قلب میں راسخ ہو جانا ازبس لازم ہے۔ اسی صورت میں آدمی ایمان کی لذّت سے فیض یاب ہو کر مقامِ آدمیت سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ حضرت علامہ کا عقیدہ تھا اور اس پر جناب محمد منور پورا یقین رکھتے ہیں۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ انسان جبلتوں کے لحاظ سے جانوروں کے مشابہ ہے مگر توازن سے کام لیا جائے تو یہی انسان ایک پرعزم مومن کا روپ دھار لیتا ہے۔

پروفیسر محمد منور نے واضح کیا ہے کہ 'خودی' کی پہچان اور اٹھان' توحید اور محمد رسول اللہ کے ساتھ قلبی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح سے منتشر اقوام کو وحدتِ افکار سے مزین انقلابی سیاسی راہنما نصیب ہو سکتے ہیں۔

مقامِ اقبال: قائداعظم کی نظر میں

قائداعظم اور علامہ اقبال تاریخ و تحریکِ پاکستان کے دو اہم کردار ہیں۔ اس مختصر مضمون میں پروفیسر محمد منور نے یہ بتایا ہے کہ قائداعظم‘ علامہ اقبال اور ان کے کلام اور ان کے افکار کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

قائداعظم نے مختلف تقاریر اور خطوط وغیرہ میں بار بار علامہ اقبال کے کلام کی تاثیر کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے اشعار نے قوم میں ولولہ پیدا کیا۔ تبھی اتنی بڑی سلطنت کے قیام کے لیے لوگ تیار ہوئے۔ قائداعظم اور اقبال باہم دوست بھی تھے اور قائداعظم نے علامہ اقبال کو اپنا راہنما بھی قرار دیا۔ اسی طرح علامہ اقبال نے اپنے آپ کو قائداعظم کا ادنیٰ سپاہی کہا۔

پروفیسر محمد منور نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا کوئی قائداعظم سے محبت کرنے والا‘ اور پاکستان سے عشق فرمانے والا‘ اور اسلام کا دم بھرنے والا شخص‘ علامہ اقبال کی توہین کا مرتکب ہوگا؟ یہاں وہ بغیر نام لیے علامہ اقبال کی توہین کرنے والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور محض اس لیے کہ وہ شخص جس نے علامہ اقبال کی توہین کی ہے‘ شاید تائب ہو جائے۔ کیونکہ‘ اگر وہ تائب نہ ہوا تو اس کی تقدیر الٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ (ص ۶۳)

مضمون میں پروفیسر صاحب نے صراحت تو نہیں کی ہے‘ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ سردار عبدالقیوم کی طرف ہے‘ جنھوں نے ناروے میں علامہ اقبال کی شان میں گستاخی کی تھی۔ پروفیسر صاحب نے ان کے اس ناروا رویے پر کچھ اشعار بھی کہے تھے۔

مضمون کے آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ کلامِ اقبال سے بھی وہی ہدایت

پاتے ہیں جن کے دل ایمان کی دولت سے فیض پا رہے ہوں۔(ص ۶۴)

قائداعظم: علامہ اقبال کا خضرِ وقت

علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی ۔آپ کی فکر ونظر کا ارتقا آپ کو یقین و اعتماد کی بلندیوں تک لے جاتا ہے ۔اور آپ اپنے ادراک و وجدان کی بدولت امت کے ایک بابصیرت رہنما کی حیثیت رکھتے تھے ۔اور اپنی بصیرت کی بنا پر ہی انھوں نے برعظیم ہندستان کے مسلمانوں کے لیے قائداعظم کو خضرِ راہ قرار دیا۔

پروفیسر محمد منور زبورِ عجم کی ایک غزل پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہاں جس خضرِ راہ کی نشان دہی کی گئی ہے اور پھر اس کے ذمے جو امور مفوضہ ہیں' ان کی رو سے یہ پیش گوئی' محمد علی جناح کے راہنما بن جانے سے پوری ہوگئی ہے ۔علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں جو خطبہ پیش کیا' اور بعد ازاں پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے جو خدمات سرانجام دیں، یہ سب اس وجہ سے تھا کہ وہ اس 'خضرِ راہ' کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے۔

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس خضرِ راہ نے قیامِ پاکستان کا فکری منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ اقبال' چودھری رحمت علی اور پاکستان

زیرِ نظر مقالے میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ پاکستان کے دشمن' ہر طریقے سے پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں ۔وہ تحریکِ پاکستان کے قائدین کے بارے میں لوگوں کو تشکیک میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔لہٰذا اس پہلو سے صحیح صورت حال بیان کرنے کی بہت ضرورت ہے ۔

وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اقبال نے پاکستان کی مخالفت کی تو اس سلسلے میں اقبال کے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے بعض خطوط کا حوالہ دیا جاتا ہے حالانکہ چشمِ حقیقت بیں سے دیکھا جائے تو اس وقت تک مسلم لیگ نے سرے سے پاکستان کا مطالبہ پیش ہی نہیں کیا تھا۔ مسلم لیگ نے یہ مطالبہ ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور میں پیش کیا۔ اس وقت بھی قرار دادِ پاکستان کا لفظ استعمال کرنے سے احتراز کیا گیا۔ نیز اقبال نے ۱۹۳۸ء کے خطبہ الٰہ آباد میں بھی دوٹوک انداز میں شمال مغربی اور مشرقی مسلم اکثریتی علاقے طلب فرمائے تھے، مگر تب بھی پاکستان کا نام استعمال نہیں کیا اور حالات کے لحاظ سے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے یہ تجویز بقول مرزا صاحب بالکل ہومیو پیتھک علاج بالمثل کی مانند تھی۔ (ص ۷۸) اور ہندوؤں اور انگریزوں کے موقف کا بڑا ہی موثر توڑ بھی تھی۔

پروفیسر محمد منور نے اس تاریخی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ دراصل 'پاکستان' نام کی جس ریاست کا نقشہ چودھری رحمت علی نے پیش کیا' وہ ایسے علاقوں پر مبنی ریاست کے قیام کا مطالبہ تھا' جہاں مسلمان، حکمران رہ چکے تھے، مثلاً پاکستان: آسام' بنگال' پنجاب' سندھ' سرحد' بلوچستان اور کشمیر کے علاوہ اور بھی ننھی ننھی مسلم پاکٹوں' مملکتوں کا مجموعہ تھا' مثلاً عثمانیہ فاروقستان' صدیقستان' روہیلستان' حیدرستان وغیرہ۔ (ص ۷۵)

یہ مطالبہ بجائے خود غلط نہ تھا لیکن اس مطالبے کی رو سے تو پھر پورا ہندستان ہی مسلمانوں کو ملنا چاہیے' کیونکہ بہر حال یہاں اس سے پہلے مسلمان ہی حکمران رہ چکے تھے۔ لیکن یہ تجویز ہندو کی شاطرانہ چالوں کے مقابلے میں بہت جلد غیر موثر اور ناقابلِ عمل ہو جاتی۔ بلا شبہ یہ تجویز مبنی بر اخلاص تھی' مگر ہندو سیاست کا جواب نہ تھی۔ اندیشہ تھا کہ ہندو اس کو غیر ضروری قرار دے کر ہندستان کی فیڈریشن اور آزادی کی

راہ مزید ہموار کر لیتے۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا نام ایک تجویز یا قرارداد کے طور پر اقبال تو درکنار قائد اعظم نے بھی استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے ذہن چودھری رحمت علی کی پیش کردہ تجویز کی طرف منتقل ہوتا تھا' اب اگر اقبال نے کہیں یہ کہا کہ میں اس تجویز کا حامی نہیں ہوں' تو اس سے یہ معنی اخذ کر لینا کہ وہ سرے سے قیامِ پاکستان کے مخالف تھے' بالکل غلط تعبیر ہے۔ چنانچہ اقبال' پاکستان کے مخالف نہیں بلکہ راہبر اور موید ہیں۔

شاعر اور 'شاعر'

قرآن مجید میں سورۃ الشعراء میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ بھٹکے ہوئے شعرا کی پیروی نہ کی جائے' کیونکہ وہ ہر وادی میں پھرتے ہیں۔ ان کے خیالات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ مرزا صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک صاحب نے اس آیت کی بالکل غلط تعبیر کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شعرا کا اتباع سرے سے ممنوع ہے۔ اس غلط تعبیر پر محمد منور نے قلم اٹھایا۔

اس مضمون کے پس منظر میں ہم مرزا صاحب کی اقبال سے گہری شیفتگی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی غلط تعبیر ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس بات کو بعینہٖ درست مان لیں تو پھر کلامِ اقبال کے وہ حصے بھی قابل قبول نہ ہوں گے جن میں انھوں نے قرآنی پیغام ہی کو پیش کیا ہے مثلاً:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن ۷۹

آپ نے بڑے دوٹوک اور طنزیہ لہجے میں معترض بزرگوار کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ قرآن نے بھی شاعر اور شاعر میں فرق روا رکھا ہے۔ پروفیسر محمد منور بتاتے ہیں کہ دراصل اس قرآنی آیت کی رو سے شعرا کے دو گروہ ہیں' ایک وہ جو ہر وادی

خیال میں سرگرداں ہیں۔ان کی پیروی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔جبکہ دوسرا گروہ ایسے شعرا کا ہے جو اپنی جادو بیانی سے مثبت خیالات کو پیش کرتے ہیں اور فکر کو معنویت عطا کرتے ہیں۔ایسے گروہ میں اقبال سب سے بلند قامت ہیں۔

ایسے میں ایک صاحب، اقبال کو محض اس وجہ سے نا قابلِ اتباع قرار دیتے ہیں کہ وہ شاعر تھے'معصوم عن الخطا نہیں تھے۔پروفیسر صاحب ان کی گفتگو کو نہایت گستاخانہ اور بے ادبی کی روش قرار دیتے ہیں۔(ص ۹۱)وہ کہتے ہیں:

ہم جواباً ایسے جملہ دریدہ دہن افراد سے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے 'ابا جانوں' اور'دادا جانوں' کو خیال میں لائیں'ان کے مقابل اقبال کی خدمتِ اسلام کا درجہ بھی ملاحظہ فرمائیں......کوئی ان معترض مکرم سے پوچھے کہ اگر کوئی شخص ان کے والد بزرگوار کو بدعمل کہے تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔......کیا یہ جواب سن کر وہ اپنے والد بزرگوار کا لقب 'بدعمل' کے طور پر قبول کر لیں گے؟(ص ۹۱'۹۲)

❑ علامہ اقبال اور خطائے الہام

اس مقالے کے آغاز میں ہی پروفیسر محمد منور نے واضح کر دیا ہے کہ یہ مقالہ اقبال کے اس شعر کی تشریح ہے:

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش۸۰

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اس خطا سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے شریعت کے احکام ہی وہ کسوٹی ہیں جن پر اس آہنگ کو پرکھا جا سکتا ہے کیونکہ غلطی کی گنجایش ہر وقت رہتی ہے۔یہ خالص دینی مسئلہ ہے لہٰذا پروفیسر صاحب نے متعدد علمائے دین کے اقوال نقل کیے ہیں اور سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ محض عقل اور ظن و تخمین کی بنا پر استوار نوائے سروش کو حتمی قرار دینا درست نہیں۔

پروفیسر صاحب نے اقبال کے اس شعر کو موضوع بحث بنا کر اقبال کو بھی صوفیہ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، یہ ان کی وسعتِ نظری کی دلیل ہے۔

❑ کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اقبال نے اپنی روایتی غزل گوئی سے انحراف کیا اور قومی فلاح و اصلاح کی ذمہ داری کا بارِ گراں اٹھایا۔ اس کے پس منظر میں غالباً ان کا کوئی روحانی تجربہ ہے، جس کی جانب کیمبرج یونی ورسٹی کے طلبہ کو خطاب کے دوران آپ نے اشارہ کیا تھا مگر آپ نے اس کی تفصیل پھر کبھی کہیں بھی بیان نہیں کی۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اس تجربے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اپنی شاعری کا انداز بالکل تبدیل کر لیا اور ہم عصر دوسرے شعرا سے بھی آپ کا یہی مطالبہ تھا کہ فن کو مقصد کا خادم ہونا چاہیے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ حالی بھی اپنے معاشرے کے بگڑے شعرا اور رؤسا سے نالاں تھے کیونکہ پوری سوسائٹی کا مزاج ہی ایسا بن چکا تھا اور شعرا اس کیفیت کو مبالغے کے ساتھ اشعار کی پرتاثیر زبان میں ڈھال کر پیش کرتے تو وہی سوقیانہ مضامین، دوآتشہ کا کام دیتے۔ مگر حالی اور اقبال کی توبیخ میں وہی لطیف و نازک فرق ہے جو حضرت علامہ اور مولانا حالی کے فنی معیار میں برقرار ہے۔ (ص ۱۰۳)

اقبال، علم الاجتماع کے اکابر کی اس رائے سے متفق نہ تھے کہ کسی قوم کے زوال کے بعد اس کا دوبارہ زندہ ہونا، ناممکن ہے۔ اقبال اسلام کو ایک عظیم الشان نظامِ حیات سمجھتے تھے، جو آیا ہی غالب ہونے کے لیے ہے۔

پروفیسر محمد منور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر ممکن طریقے سے، اس آفاقی پیغام کو پیش کرنے کے لیے فن کی اعلیٰ ترین صورت اختیار کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے قوم کو جگانے کا فریضہ اٹھالیا۔ پروفیسر محمد

منور اقبال کے ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جن میں اقبال نے قوم کو جگانے کے لیے کمر ہمت کس لینے کا عزم کیا ہے۔

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز

زیر نظر مقالے کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ داخلی حسیات کی تلاش اور اندرونی حقائق کی بازیافت کسی عام انسان کے بس میں نہیں ہے۔ یہ اگر ممکن ہو سکتا ہے تو صرف ان کے لیے' جو متقی ہیں اور قرآن سے ہم آہنگ ہیں اقبال بھی ان روحانی عناصر کا ادراک رکھنے والے تھے' اسی لیے وہ کہہ گئے ہیں:

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی۸۱

الغرض انسان کے دل میں مستور یہ اندرونی آفتاب ہے' جو ہوتا ہے' جو انسان کے دل میں مستور مختلف کیفیتوں کے اسرار کھول دیتا ہے اور اس کی نشوونما قرآن ہی کے ذریعے سے ممکن ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے مطالب کو محض زبان سے ادا نہ کیا جائے بلکہ دل پر نازل کیا جائے اور دل کی گہرائیوں تک یہ مفاہیم نفوذ کر جائیں تاکہ عمل میں ڈھل جانے کی قوت رکھتے ہوں اور جب سبھی افراد امت اس عمل کے مطابق روزمرہ فرائض انجام دیں گے جو قرآن میں تجویز کیا گیا ہے تو پھر امت حقیقی معنوں میں امت بن کر ابھرے گی۔ اقبال نے کہا تھا:

؎ خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۸۲

پروفیسر محمد منور اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ عقلی دلیلوں' منطق کے اصولوں

اور فلسفے کی باریکیوں سے قرآن نہیں سیکھا جاسکتا..... قرآن دل میں اترے اور روح کی طرح اترے تبھی صحیح معنوں میں اس کا مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ انسان کو سرشاری اور عزم' قرآن کو حرزِ جاں بنا کر ہی حاصل ہوگی۔۸۲

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال کو قرآن مجید سے جو شغف تھا، وہ آپ کے متعدد اشعار سے واضح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اقبال نے اس قرآنی بصیرت سے جو' نورِ بصیرت حاصل کیا، اس کی بنا پر وہ 'سوزِ جگر' کے مالک بن گئے تھے۔ آپ دعا گو تھے کہ یہی اب امت کے ہر فرد کو عطا کر دیا جائے کہ یہی قیمتی ترین متاع ہے۔

اقبال خود بھی خواہاں تھے کہ وہ قرآن کے مطالب کو افکارِ حاضرہ کی روشنی میں واضح کرکے کتابی صورت میں پیش کریں۔۸۳ مگر معاشی و خانگی مسائل اور صحت اور بینائی کی کمزوری نے انھیں اس کام کی مہلت نہیں دی۔

❑ سوالِ اقبال' شاعر، ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں؟

شاعری ایک ذمہ دار شاعر ہی کا کام ہے' اور پروفیسر محمد منور کے الفاظ میں اقبال پر شاعر کی شاعرانہ مسئولیت عہدِ نوجوانی ہی میں واضح ہوگئی تھی۔ (ص ۱۱۸) اور آپ کی شاعری نے ایک واضح اور بامقصد سمت اختیار کر لی تھی:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری' نفس مرا شعلہ بار ہوگا۸۴

یہ گویا مرجہ شاعری کے خلاف آپ کا اعلانِ جہاد تھا۔ یہاں پروفیسر محمد منور سوال اٹھاتے ہیں:

یہ پاک و ہند کا اسلامی معاشرہ اپنے دورِ انحطاط میں کس کس اذیت اور شرمندگی سے دوچار نہیں ہوا۔ لیکن ہزار ہا شعرائے کرام میں سے وہ کتنے تھے جنھوں نے قومی اور ملی معاملات کو اپنی توجہ کی شان کے شایان جانا...... وہ اکابر جن کے قافیوں کی چستی

اور محاوروں کی پھرتی مشاعروں کی فضا کو محشرستان بنا دیتی رہی ہے' اور آج بھی بنا رہی ہے' کیا معاشرتی زندگی اور خصوصاً اس کے آدم گر اور اخلاق پرور پہلو کا کوئی حق نہیں کہ اسے بنا سنوار کر پیش کیا جائے اور اس طرح افراد کی تعمیر میں مدد ہو کر اپنے معاشرے کو طاقت ور اور متوازن معاشرہ بنایا جائے۔(ص ۱۲۲)

اقبال کے نظریہ شاعری کی وضاحت کے بعد، پروفیسر صاحب عہد حاضر کے حالات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کیا آج اس بات کی ضرورت ہے کہ افراد و اقوام میں ولولہ پیدا کیا جائے۔وہ پوچھتے ہیں کہ شاعروں کے یہ گروہ ملّی اور قومی معاملات کے بارے میں اس قدر بے فکر اور بے بس کیوں؟ کیا تعقل اور علم سے معمور کھوپڑیاں ملّی غیرت کا ویرانہ ہوتی ہیں؟(ص ۱۲۴) مقالے کا مغز یہ ہے کہ اصلاح احوال کے لیے شعرا کو اقبال کی سی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے۔

❑ فردوس میں ایک مکالمہ: حضرت علامہ اقبال کی ایک نظم

علامہ کی نظم 'فردوس میں ایک مکالمہ' حالی اور سعدی کے درمیان ہونے والی گفتگو پر مشتمل ہے۔حالی اور سعدی میں پروفیسر صاحب کے خیال سے کئی پہلوؤں سے مماثلت موجود ہے اور اقبال کی نکتہ شناس نگاہ نے بقول پروفیسر محمد منور دونوں کے مابین کئی رشتے ڈھونڈ نکالے ہیں۔(ص ۱۲۵)

سعدی اور حالی دونوں 'طوائف الملوکی' کے عہد میں ہوش سنبھالتے ہیں۔حالی اور سعدی علاقائی دوری کے باوجود ذہنی قربت کی وجہ سے ایک دوسرے سے بے تکلفی کے ساتھ محوِ گفتگو ہیں۔دونوں کے مسائل ایک سے ہیں۔دراصل اقبال نے حالی و سعدی کے مکالمے میں اپنے نظریات و افکار کو پیش کیا ہے کہ مغربی تعلیم کی ترویج سے ایمان رخصت ہو گیا، مادی نقطۂ نظر کے حامل نصاب نے رفتہ رفتہ ذہنوں کو مسموم

کردیا۔ دینی علوم کے ماہر بے قدر و قیمت تھے، مگر انگریز کا مڈل پاس بھی با قیمت تھا۔ بہر حال نئی تعلیم کے باعث عقیدوں میں تزلزل آ گیا اور ذہن الجھ کر رہ گئے۔ اس دورِ غلامی نے تشکیک کے جو بیج ذہنوں میں بوئے ہیں ان کی وجہ سے معاشرے بھی انتشار اور عدمِ توازن کا شکار ہو گئے ہیں، اور بقول محمد منور صاحب جس طرح غیر متوازن انفرادی وجود بیماری کا علاج نہ کرے یا نہ کر سکے تو وفات پا جاتا ہے، اسی طرح بے توازن اجتماعی وجود (یعنی معاشرہ) بھی رحلت کر جاتا ہے۔ (ص ۱۳۴)

اس سے بچنے کے لیے ایمان درکار ہے کہ ایمان کی بدولت ہی روح کو بنیاد ملتی ہے۔

نظم مذکورہ میں ایک جگہ حالی کی زبان سے سعدی کو ایک التجا پیش کی گئی کہ مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند کی اس غفلت اور بے پروائی کا ذکر نبی اکرم ؐکے حضور نہ کیا جائے، ورنہ مسلمان مجھے چغل خور کہیں گے۔ (ص ۱۳۰)

آخر میں پروفیسر صاحب اس بات کی تصریح ضروری سمجھتے ہیں کہ اقبال نہ تو ماضی پرست تھے اور نہ حال مست۔ وہ جدید تعلیم کے دشمن نہ تھے مگر ان کا خیال تھا کہ ان راستوں پر چلنے والوں کو یہ حقیقت جان کر چلنا چاہیے کہ وہ کس جانب رواں دواں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے نام، پتے، گھر تک سے ناآشنا ہو جائیں۔

یہاں جناب منور صاحب حسبِ معمول ہماری توجہ عصرِ حاضر کے اہم مسئلے کی جانب مبذول کراتے ہیں کہ:

آزاد و خودمختار ہو جانے کے بعد، پاکستانی امت مسلمہ نے اس ناقص اور مُضر طرزِ تعلیم میں کون سی کامیاب تبدیلی پیدا کی ہے، پھر ہم روحانی اور دینی لحاظ سے بلند ہوئے یا پست؟ متحد ہوئے یا منتشر؟ (ص ۱۳۴)

یہ مرزا صاحب کا خاص انداز و اسلوبِ بیان ہے جو بڑا ہی وقیع اور قابلِ توجہ ہے۔

علامہ اقبال اور اصولِ حرکت

علامہ اقبال ایک صاحبِ بصیرت فلسفی اور شاعر تھے‘ لہٰذا اسلام کو ماضی کا قصۂ پارینہ بنا کر رکھ دینے کے سخت خلاف تھے۔ آپ اسلام کو ایک حرکی قوت کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے، اسی لیے اجتہاد پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال نے ’اسلام میں اجتہاد‘ کے عنوان سے اپنا پہلا مقالہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج‘ لاہور میں پڑھا تو انھیں کافر قرار دیا گیا۔ اقبال کی شاعری اور مذکورہ مقالے کی روشنی میں، ان کے تصورِ اجتہاد کا جو نقشہ سامنے آتا ہے‘ پروفیسر صاحب نے بہ اختصار اسے بیان کیا ہے

۔

وحی کا انقطاع دراصل اس امر کی دلیل ہے کہ اب آدم رفتہ رفتہ عقلی بلوغ کی منزل کو پہنچ چکا ہے۔ اب اسے اس طرح مزید پابند نہیں رکھا جائے گا، ایک وقت تھا جب یہ لازم تھا کہ فقہی صورت حال کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے مگر اب ایک طرف حصولِ آزادی کے ولولے کو تازہ کرنے اور رکھنے کی ضرورت ہے‘ تو دوسری طرف یہ بھی لازم ہے کہ جب آزادی میسر آجائے تو مسلمان حسبِ تقاضائے زماں، اپنے سرمایۂ فقہ کا ازسرِنو جائزہ لیں اور جرأت و ہمت کے ساتھ پیش آمدہ امورِ معاشی و دینی و سیاسی کا حل تلاش کریں۔ (ص ۱۳۷)

علامہ اجتہاد کا حق کسی ایک فرد کو دینے کے بجائے پارلیمنٹ کو دینے کے قائل تھے جس میں علمائے دین اور ماہرینِ فقہ کے ساتھ شعبہ جاتی ماہرین علوم بھی موجود ہوں

۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال تو ۱۹۳۸ء میں کوچ کر گئے‘ ان کی پیش گوئیاں بعد میں مسلم ممالک کی آزادی کی صورت میں پوری ہوئیں اور ۱۹۴۹ء میں مسلم ممالک

کی پہلی اقتصادی کانفرنس منعقد ہوئی۔ عالمِ اسلام کا ایک مشترک سیکریٹریٹ بھی وجود میں آچکا ہے مگر پروفیسر محمد منور کے خیال میں ایک ایسے ندوے کی بہر حال ضرورت ہے جہاں پوری امت مسلمہ کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اس طرح ہم غیر مسلم ممالک سے لیے ہوئے دستوری قرضے بھی لوٹا سکیں گے۔ مرزا صاحب بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجتہاد کو عصرِ حاضر کے مسائل سے مربوط کر دیتے ہیں۔

آخر میں وہ کہتے ہیں کہ جب ہم اجتہاد کے خوگر ہو جائیں گے تو:

ہم دستوری معاملات میں خود اعتمادی پیدا کر لیں گے اور سعی و کوشش سے اس میدان میں بھی خود کفیل ہو جائیں گے تو پھر مختلف غیر مسلم ممالک سے لیے ہوئے دستوری قرضے بھی لوٹا دیں گے۔ مسلم امت اس وقت کہیں فرانسیسی قواعد کی مقروض ہے، کہیں برطانوی قواعد اور عدالتی نظام کی، کہیں سوئٹزرلینڈ کے ضوابط مستعار لیے ہوئے ہے اور کہیں اطالوی، ہسپانوی اور ولندیزی۔ ان شاء اللہ دیگر قرضوں کی طرح ہم یہ قرض بھی اتار دیں گے۔ ۱۴۰

❑ علامہ اقبال: اجتہاد کو بنیادی اہمیت دیتے تھے

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اسلام اس بات کا حق دار ہے کہ عصرِ حاضر کے جدید مسائل کو اس کی کلی روح کی روشنی میں دیکھا جائے۔ یہ اسلام کے پیروکاروں کا کام ہے کہ وہ اس پہلو سے بھی اسلام کو زندہ و بیدار دین ثابت کریں۔ پروفیسر صاحب نے علامہ کے نظریۂ اجتہاد کو اس مقالے کا موضوع بنایا ہے۔

وہ بتاتے ہیں کہ اسلامی فقہ کے ساتھ علامہ کی یہ دلچسپی عمر کے آخری حصے میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے خطوط میں بھی اس آرزو کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے اپریل ۱۹۲۶ء کے ایک خط میں اپنے ایک رسالے اجتہاد کا

بھی ذکر کیا ہے' آپ نے اس کو طبع نہیں کروایا۔

پروفیسر صاحب بتاتے ہیں کہ علامہ کے خیال میں اجتہاد کے بند ہونے کی وجوہ میں بنو عباس کے دور میں فروغ پانے والی عقلیت' متکلمین اور فقہا کی عقلی و فقہی موشگافیاں اور سقوطِ بغداد شامل ہیں۔ مسلمانوں کے اندر خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اسلامی سوسائٹی کا بنیادی ڈھانچا ضائع نہ ہو جائے۔ اقبال ایک حد تک خود بھی اس رویے کی تائید کرتے ہیں مگر ساتھ ہی وہ صراحت بھی کرتے ہیں کہ ہمیں بہر حال اسلام کی نشاتِ ثانیہ کا عملی کام کرنا ہے اور اس کے لیے حق اجتہاد کو استعمال کرنا ہو گا' کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

❑ علامہ اقبال' اجتہاد اور ختم نبوت

پروفیسر محمد منور نے سابقہ مقالے میں اقبال کے تصورِ اجتہاد کی توضیح کی تھی، زیرِ نظر مقالہ بھی اجتہاد سے متعلق ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اقبال کے خیال میں ختم نبوت کا تصور دراصل اس امر کی دلیل ہے کہ اب حق اجتہاد بعد میں آنے والے مسلمان علما کو حاصل ہے اور یہ کہ انسانی عقل رفتہ رفتہ بلوغ کی منزل کو پہنچ چکی ہے۔ اس کی عقل اور فہم اب خود اپنے راستے تلاش کرے گی تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔ اسی لیے اب اجتہاد کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں فقہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

فقہ کو ہر زمانے کا ساتھ دینا ہو گا۔ یہ ختم نبوت کی عطا فرمودہ ذمہ داری ہے (ص ۱۵۸)

وہ کہتے ہیں کہ اجتہاد کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ کائنات سکون کے بجائے حرکت سے عبارت ہے' اس سے قبل مرحلہ بہ مرحلہ پیغام آتے رہے۔ مگر پیغام کی تکمیل

آنحضورا کی بعثت پر ہوئی۔ مگر اس اختتام میں یہ شک نہ رہنا چاہیے کہ اب زمانے کے حالات و مسائل خواہ کیسے بھی ہوں' پیغام اس صورت میں رہے گا۔ یہ شریعت ہر دم حرکت پذیر ہے اور روحِ تازہ کی مالک ہے۔ لہٰذا اصولِ حرکت کو جامد نہ ہونے دیا جائے۔(ص ۱۵۶)

اگرچہ اس سے قبل علمائے دین نے اس اہم فرض کو پس پشت ڈالے رکھا اور اپنی سہولت پسندی کے باعث اسلاف کی فقہ ہی پر قانع رہے' لیکن اقبال نے جہاں دیگر شعبہ ہائے علم کو ایک حرکی وجود بخشا' وہاں اجتہاد کے موضوع کو بھی زندہ کیا اور بقول پروفیسر محمد منور: علامہ نے یہ کہہ کر کہ 'پوشیدہ قرار میں اجل ہے' حرکت و اجتہاد کو واضح اور روشن کیا۔ یہی نکتہ کلام اقبال کی روح ہے۔(ص ۱۵۴)

▢ اقبال بحضور آدم ؑ:

دو حصوں پر مشتمل زیرِ نظر مقالہ نسبتاً طویل ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں ایک علاحدہ کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اقبال کے ہاں آدم کی خود شناسی اور اس کے مقام و مرتبے کے سلسلے میں جو تفصیل ملتی ہے' زیرِ نظر مضمون میں پروفیسر محمد منور صاحب نے اس پر بحث کی ہے۔ آپ کے خیال میں داغ کے رنگ کی شاعری کو ترک کرنا اقبال کی شاعری کا ایک بہت اہم موڑ تھا۔ یورپ کے قیام سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے۔ بعد ازاں اپنے اندر کے مضطرب خیالات کے اظہار کے لیے ۱۹۱۰ء میں اقبال نے اسرارِ خودی لکھنا شروع کر دی۔ اقبال کی یہ کوشش امت مسلمہ کے ایک ایسے فرد کی سی تھی جو امت مسلمہ کے درد میں بے چین تھا:

بہر انساں چشم من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرار زیست ۸۵

اور یہی درد ان کو فکر و خیال کی اس بلندی تک لے گیا، پھر آپ نے انسان کے لیے وہ فلسفہ پیش کیا جو بہت جامع اور ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کہ محض یورپی معاشرے کے اثرات کے تحت حضرت علامہ کے مزاج میں ایک انقلاب رونما ہو گیا تھا۔ ان کی تبدیلی میں ان کے اندرونی عقائد و ایمان کا ہاتھ تھا۔ مرزا صاحب اس سے بھی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال کے ان تمام افکار کے پیچھے ایک طرف آدم کی فطری شان اور اس کا استحقاق تھا' دوسرے آدم کی بنی آدم کے ہاتھوں رسوائی اور بربادی کا منظر تھا۔ (ص ۱۶۹)

پروفیسر صاحب نے اقبال کے فلسفۂ آدم کا جو پس منظر بیان کیا ہے' وہ اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں آپ ایک اور سوال اٹھاتے ہیں کہ اقبال نے آدم کے لیے ترقی اور نشوونما کا جو فلسفہ پیش کیا ہے، وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہے یا پوری امت اس کی مخاطب ہے؟ یہاں انھوں نے محمد سعید الدین جعفری کے نام اقبال کے ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء کے خط کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں' بلکہ بیس سال کی آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوامِ انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت 'اسلام' ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے' اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوع انسان قدیم توہمات سے نجات پائے۔ ۸۶

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اقبال پوری نوعِ انسانی کو مسائل سے نجات دلانے کے لیے کوئی حل تلاش کرنے کے متمنی تھے اور یہ حل انھیں اسلام کی تعلیمات ہی میں ملتا تھا۔ محمد منور نے اس کو 'بحالیات آدم' سے موسوم کیا ہے۔

آدم کے سلسلے میں اقبال کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آدم کی کون سی حیثیت اس کے شایان شان ہے۔ پروفیسر محمد منور کے مطابق اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اولادِ آدم کو بنے بنائے اور کاملاً مشخص کر کے دنیا میں نہیں بھیجا گیا' بلکہ اس کی شخصیت کو کئی ارتقائی مدارج بت معبود بنا لیے جاتے ہیں' کیونکہ خدا کی فطری ضرورت کا احساس آدم کے دل میں موجود ہے۔ بقول اقبال:

ذوق حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ امید وار را ۹۰

جب روح ان سہاروں کو تلاش کرتے ہوئے اصل سہارے تک پہنچ جاتی ہے تو یہی آدم کی خودشناسی ہے جہاں سے خداشناسی کی راہ نکلتی ہے۔(ص ۱۹۵)

❑ اقبال بحضور آدم ۲:

مقالے کے دوسرے حصے میں آدم کی خفتہ صلاحیتوں اور جملہ امکانات سے بحث کی گئی ہے اور یہ تمام پہلو قرآنی مباحث ہی کی تفسیر ہیں۔ یہاں سب سے پہلے پروفیسر صاحب نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ یفعل ما یرید۔ نفخ روح اور پیمان الست کی رو سے کہیں آدم بے بس اور مجبور محض تو نہیں ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔وہ امانت جس کا ذکر سورۃ الاحزاب میں ہے، آدم کے اختیار کی دلیل ہے۔وہ خودمختار ہے ورنہ جس کے پاس قوت کمال کی صلاحیت نہ ہوتو اس کو عقل و عمل کے ذریعے سے اختیار کی آزادی کیسے دی جا سکتی ہے؟ اور پھر اگر آدم زمین کے ساتھ نہ چپک کر رہ جائے اور حق آزادی کو استعمال کرتا رہے' اپنے نورِ قدیم کو استعمال میں لاتا رہے' تو یقیناً خدا سے وہ قرب حاصل کر سکے گا' جس کا وہ اندازہ نہیں کر سکتا۔

انسان میں پوشیدہ انھی مثبت امکانات کے پیش نظر ہی آدم کو جنت سے زمین پر بھیجا

گیا۔اقبال اس پر ایک منفرد نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔اقبال آدم کو جنت سے زمین پر بھیجے جانے پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ آدم نے غلطی کا ارتکاب کر کے 'اختیاری آزادی' کا ثبوت دیا۔یہ اس کی خودی کی پرورش کی جانب پہلا قدم تھا اور زمین پر بھیجے جانے سے اس کی اس 'خودی' کے جوہر میں بے پناہ اضافہ متوقع تھا۔ نیز اللہ نے تو اسے پیدا ہی 'زمین میں خلیفہ بنانے کے لیے کیا تھا، پھر اس کا جنت میں کیا کام! اس وجہ سے بقول محمد منور صاحب اقبال نے آدم کے جنت سے نکالے جانے کو وعید نہیں بنایا' اسے باعزت وداع کی صورت دی ہے اور زمین پر ورود کو استقبالِ مسعود بنا دیا ہے۔یہاں بھی وعید کا لہجہ نہیں عید کا ہے۔(ص ۲۰۷)

پروفیسر صاحب اس کے بعد کہتے ہیں کہ اقبال ابلیس کو آدم کے لیے ایک امتحان سمجھتے ہیں' ایک ایسا امتحان جس میں کامیاب ہو کر آدم کی صلاحیتوں میں نکھار آ جاتا ہے۔ یہاں پروفیسر محمد منور نے ایک واقعے کی رو سے اقبال کے اس خیال کی وضاحت کی ہے۔آدم کی جملہ قابلیتوں کی نشوونما کے لیے ابلیس کا وجود زحمت نہیں رحمت ہے۔اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ مجھے وہ جہاں بھی قبول نہیں جہاں یزداں تو ہو مگر شیطان نہ ہو:

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد۹۱

اقبال کی خواہش ہے کہ آدم اس قدر خودشناس ہو جائے کہ شیطان شکست سے ہم کنار ہو اور یہ کام صرف ایمان کی قوت ہی سے ممکن ہے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آدم خود اپنے مقام سے آگاہ ہو۔

آخر آدم خودشناسی کا مرحلہ کیوں کر طے نہیں کر پاتا؟ پروفیسر محمد منور نے فکرِ اقبال سے یہ توجیہہ اخذ کی ہے کہ آدم شاید اپنی حقیقت کو سمجھنے سے گھبراتا ہے۔اسے اپنی

حقیقت کا علم ہو جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے اس حیثیت کے مطابق ایک ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ مگر آدمی خاک سے پیدا ہوتا ہے اور بقول علامہ اس کے وجود کا مادی خلقی پہلو اس پر حاوی رہتا ہے۔ آدم چونکہ محض حواسِ خمسہ ظاہری سے اپنا کام چلانے کا عادی ہے اور اب سائنسی ترقی نے اس کے اندرونی اور خرق العادات کمالات کو بھی کمزور کر دیا ہے۔ بقول پروفیسر منور صاحب: 'یوں دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے آدمی کو اپنے 'فن' سے مزید دور کر دیا ہے۔ یہ خالص روحانیات کی بحث ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال ذرۂ قدسی میں موجود بے پناہ امکانات پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں آدم کو اس وقت تک استحکام نصیب نہیں ہو سکتا' جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے اور ماسوا اللہ کی محبت یا غلبے سے نجات پا لے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آدم خودشناسی کی منازل خداشناسی ہی کے ذریعے سے طے کر سکتا ہے۔

❑ علامہ اقبال اور آدم کی خودگریزی

علامہ اقبال اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے' لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ آدم اپنے اس مقام سے بے خبر ہے اور جب اسے اس کے مقام سے آگاہ کیا جائے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس مقام بلند کے تقاضے پورے کرنا شروع کر دے تو اس کو زندگی کی بہت سی سہولتوں اور آسائشوں سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا۔ (ص ۲۳۷)

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بلند مقام کو حاصل کر لے' تو اس کے ساتھ یہ ردعمل پیش آ سکتا ہے کہ اس کو بہت فائق سمجھ کر افرادِ معاشرہ اس سے دشمنی کرنے لگ جائیں۔ جیسے پیغمبروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ فائق عادات ہر انسان کے بس کی

بات ہے' بشرطیکہ ہم ان کی تربیت کریں۔ مگر ہونے یہ لگا ہے کہ ہم اپنے ظاہری حواسِ خمسہ سے بھی کم کام لیتے ہیں اور سائنسی آلات کے محتاج ہو گئے ہیں، اور خود شناسی کے امکانات اور کم ہو گئے ہیں۔ (ص ۲۳۹' ۲۴۰) انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ محض مادی وجود نہیں ہے' بلکہ اس کے خاکی پیکر میں 'میں' موجود ہے' اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اسے اپنے اندر جھانکنا ہوگا۔ اس طرح اسے اپنے اندر کا 'نور' نظر آ جائے گا۔ حضرت علامہ کے اس نظریے کو پروفیسر صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

یہ نور اگر آدم کے حیوانی وجود سے مغلوب ہو جائے اور اس طرح عالم خلق کے مادی بوجھ تلے دب جائے اور دبا رہے تو وہ ایک عقل مند دو پایہ بن سکتا ہے' اور ایک دو پایے کی حیثیت سے خوش گفتار' خوش خیال' خوش فکر وجود تو بن سکتا ہے' مختلف علوم میں دسترس بھی حاصل کر سکتا ہے' مگر خود اسے اپنی ذات سے آگاہی میسر نہیں آ سکتی۔ اسے اپنی ذات سے آگاہی' نورِ مطلق سے آگاہی کی بدولت ہی میسر آ سکتی ہے۔ (ص ۲۴۳)

اس نور کی تربیت کرنے کے لیے صرف خدا کے آگے جھکنا لازم ہے۔ دنیا کی لذتیں' سارے بندھن' عقل اور علم یہ سبھی اس کی خودی کے جوہر کو زنگ لگا دیتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان سے بچے اور ان سے اتنا ہی فائدہ اٹھائے' جتنا ضروری ہے' نیز یہ بھی کہ کائنات کے امتحانوں کو نعمت سمجھ کر بلندی کی طرف بڑھے۔ مگر آدم اس مشقت سے گھبراتا ہے۔ یہاں پروفیسر محمد منور صاحب کہتے ہیں کہ اگر سمجھا جائے تو ابلیس بھی اس کے لیے ایک نعمت ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے ایمان کو آزما سکتا ہے۔ الغرض کائنات آدم کی تربیت پر مامور ہے۔ حضور پاکؐ کی سیرتِ اکمل ہمارے سامنے بطورِ نمونہ ہے۔ قصور صرف آدم کا ہے کہ وہ اپنی خود شناسی کے لیے حوصلہ نہیں کرتا اور نہ کوشش۔

یہ مضمون خاصے دقیق فلسفیانہ انداز سے لکھا گیا ہے' مباحث مشکل ہیں مگر پروفیسر صاحب نے فکرِ اقبال کی بہترین توضیح کی ہے۔

علامہ اقبال: نقیبِ انقلاب

بقولِ پروفیسر محمد منور علامہ کی شاعری کا بیشتر حصہ ایک باعزم و ایمان اور صاحبِ فن کی ان تھک کاوش کا مظہر ہے۔ وہ ابھی یورپ ہی میں تھے تو انھوں نے فیصلہ فرما لیا تھا کہ:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو شرر فشاں
ہوگی آہ میری' نفس مرا شعلہ بار ہوگا ۹۲

اقبال آخری دم تک اپنے فن کی مقصدیت سے غافل نہیں ہوئے۔ اس میں ان کے دینی ماحول کا پس منظر بھی شبہ اہمیت رکھتا تھا۔ بیرونی ماحول سے ان کا تصادم بھی غیر شعوری نہ تھا، اس میں ایک مقصدیت شامل تھی اور یہ مقصدیت فکر تک محدود نہ تھی بلکہ آپ نے عملاً بھی اس جہادِ کارزار میں حصہ لیا۔ آپ نے برعظیم کے مسلمانوں کی منزل آزادی کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے قائداعظم کو بھی تیار کیا۔

یہاں مرزا صاحب رک کر اس امر پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ آخر وہ ان تمام فکری' علمی' ادبی' سیاسی' مجلسی اور شعری فتوحات پر کیونکر قادر ہوئے؟ اس کا جواب وہ اقبال کے الفاظ میں یوں دیتے ہیں:

تیرا　　زمانہ　　تاثیر　　تیری
ناداں!　　نہیں　　یہ　　تاثیرِ　　افلاک ۹۳

اقبال نے عملاً یہ کر کے دکھایا' ماحول کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور اپنے اردگرد کو مسخر کر کے دکھایا مگر اس کے لیے پہلے ایمان و یقین کے مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔

سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

عید الاضحیٰ کس سوچ اور کس جذبے کا مطالبہ کرتی ہے اور وہ یاددہانی یہ کہ اللہ کی خاطر دنیا کی سبھی چیزیں قربان کر دینے کا جذبہ ہی خدا کو مطلوب ہے' مگر یہ جذبہ جس کا حقیقی تعلق دل سے ہے' آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب زیرِ نظر مضمون میں ملتا ہے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں یہ جذبہ علم' عقل اور تجربے سے زیادہ عشق کا معاملہ ہے۔ اس عشق کی بنا پر ابراہیمؑ آگ میں کود گئے تھے۔

دوسری طرف یہی واقعہ یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ آخر اسماعیل ں کے جذبۂ ایمانی کا سبب کیا تھا؟ جس کے باعث انھوں نے اپنی گردن بسہولت پیش کر دی۔ ابراہیمؑ کا ایمان پختہ ہونے کے تو کئی مواقع آ چکے تھے۔ اسماعیل کی یہ کیفیتِ خودسپردگی باعثِ حیرت ہے۔ اقبال نے اس استفسار کا جواب یوں پیش کیا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی ۹۴

بقول مرزا صاحب یہ شعر بظاہر استفسار ہے۔ درحقیقت جواب ہے اور جواب یہ ہے کہ علم سے فقط معلومات میں اضافہ ہوتا ہے' علم سے ایمان و ایقان حاصل نہیں ہوتا۔ (ص ۲۶۰) یہ علم سے آگے بڑھ کر باپ کی باکمال شخصیت کا اثر تھا جو صاحبِ کردار بھی تھا اور صادق القول بھی۔

آخر میں پروفیسر صاحب ابراہیمی صفت کے اس پہلو سے یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ خطیبوں کے خطبے کیوں ضائع جا رہے ہیں' ماں باپ کی تلقین کیوں برباد ہو رہی ہے؟ اساتذہ کی نصیحت کیوں دلوں میں راسخ نہیں ہوتی؟ اہلِ سیاست کے اقوال و ارشادات کیوں اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیے جاتے ہیں؟ (ص ۲۶۱'۲۶۲)

خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

اقبال نے افراد اور قوموں کو زندہ رہنے کا طریقہ سکھایا ہے' اس میں کشاکشِ حیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس سے انسان میں جو جوابی قوت عمل پیدا ہوتی ہے' وہ زندگی کے لیے بڑی ہی مفید ہے۔ پروفیسر صاحب بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر نیاز احمد (ڈائریکٹر شعبۂ کیمیکل ٹیکنالوجی' جامعہ پنجاب) نے روایت کی کہ ایک بار علامہ اقبال سے گفتگو ہو رہی تھی اور موضوع تھا کہ ہر آزمائش اور امتحان اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اس سے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نیاز صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اقبال کی بات کاٹ کر کہا کہ شیطان بھی تو ایک مسلسل امتحان ہے۔ فرمایا کہ ہاں بالکل ہے۔ یعنی شیطان بھی درپردہ آدمی کے حق میں اللہ کی رحمت ہے۔ (ص ۲۶۴' ۲۶۵)

انسان کو ہر لحاظ سے قوی ہونا چاہیے تاکہ کوئی اسے تر نوالہ سمجھ کر نگل نہ جائے یا کمزور سمجھ کر مسل نہ ڈالے۔ علامہ اقبال نے اس کے لیے قطرۂ شبنم اور الماس کے ذرے کی مثال دی ہے۔ قطرۂ شبنم کو پیاس بجھانے کے لیے ختم کر دیا' جبکہ ذرۂ الماس چونکہ ٹھوس تھا' لہٰذا نگلا نہ جا سکا۔ اس لیے الماس کا یہ معمولی ذرہ زیادہ قیمتی ہے کہ وہ اگر نگل بھی لیا جائے تو گلے میں خراش ڈال کر اپنے وجود کا پتا دے گا۔

دراصل اقبال افراد اور قوموں کو خود شناسی کی جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں، اس تک پہنچنے کے لیے جا بجا امتحان گاہیں نہ ہوں تو آدم کے اندر مضمر ممکنات بروے کار نہیں آ سکتے۔

مرزا منور' فکر اقبال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ قوموں کو جب بھی اپنے سے فائق تر اشخاص سے واسطہ پڑتا ہے تو ان کی قوتیں ترقی کرنے لگتی ہیں۔ پھر وہ اس اصول کی

روشنی میں ملتِ پاکستان کا ذکر کرتے ہیں کہ بحیثیت ایک قوم کے ہمیں، فی زمانہ حالتِ زوال کو دور کرنے کے لیے اپنے دشمنوں اور حلیفوں کی ضرورت ہے کہ ہماری غیرت کو تازیانہ دشمنوں کی بدولت لگتا ہے۔(ص ۲۶۲)

بعض احباب کی یہ رائے مرزا صاحب کو بہت معقول محسوس ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل ہندوؤں سے مقابلے کی وجہ سے غلامی کے باوصف ہمارے نوجوان زیادہ محنتی اور قابل تھے کہ ان کے سامنے ہندوؤں کا چیلنج موجود تھا۔لیکن اب بھی ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اب ہمارا مقابلہ محض ہندوؤں سے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم سے ہے'نیز اب ہمیں ہر ہر میدان میں جنگ کرنی ہے اور اس امت کو خدا نے مینڈیٹ دیا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں مداخلت کر کے وہاں ظلم و نا انصافی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔(ص ۲۷۱) مگر قرآن پر یقین محکم نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس آیت پر پورا یقین نہیں رکھتے اور اس وقت مقہور و مظلوم بنے ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب کا یہ مضمون ۲۱/ اپریل ۱۹۸۵ء کو ایک اخبار میں شائع ہوا۔آپ نے ۲۱/ اپریل کے حوالے سے یہ پیغام دیا ہے:

ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔چاہیے کہ یہ صورتِ حال مایوسی نہ پیدا کرے' اس کا مداوا یہ ہے کہ ہم تقاضائے فطرت کو جانیں اور اپنی ہستی کو اور اس کی اہمیت کو صحیح معنوں میں پہچانیں...... اگر ہمیں دنیائے آدم کی امامت کا حق ادا کرنا ہے تو ہمیں اپنے آپ کو پہلے اس کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔(ص ۲۷۳)

❑ دل مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دو بارہ

زیرِ نظر مقالہ اس امر سے بحث کرتا ہے کہ قوموں کی تقدیر' افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے' اس لیے اقبال نے فرد کو ملت کے مقدر کا ستارہ قرار دیا ہے' اگر کسی معاشرے

میں ایسے افراد موجود ہوں‘ جو زندہ و بیدار دل کے مالک ہوں تو وہ معاشرہ دنیا میں ممتاز مقام حاصل کر سکتا ہے۔

خرابی و تباہی کا بنیادی سبب علامہ اقبال کے نزدیک ایسے افراد ہیں جن کے دلوں پر تن کی حکمرانی ہوتی ہے‘ ان کی دانش ان کی بے لگام خواہش کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ‘ بقول پروفیسر محمد منور‘ یہ ہوتا ہے کہ یہ بے راہ روی افراد کو لاشعوری طور پر بدی کے قریب لے آتی ہے۔ معاملہ اور بڑھ جائے تو یہ بدی فیشن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ (ص ۲۷۸) افراد بغیر سوچے سمجھے نقالی کرنے لگتے ہیں اور بدی اور خیر میں امتیاز نہیں کر پاتے اور ذہنی طور پر غلام بن جاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک ایسے غلاموں کی بصیرت پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دراصل ان کے دل مردہ ہو جاتے ہیں اور دل زندگی سے جتنے محروم ہوں‘ روح پر مردنی چھائی ہو۔ بقول پروفیسر محمد منور صاحب‘ جسم اتنا ہی تنتا ہے۔ (ص ۲۸۰)

اقبال کی اس فکر سے مرزا صاحب ہماری عمومی زندگی کے لیے یہ اصول اخذ کرتے ہیں کہ جو شخص سوسائٹی میں جتنے اونچے مقام پر فائز ہو‘ اسے اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہونا چاہیے۔ (ص ۲۷۸)

❏ ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

اقبال اور ان کے معاصر فلسفی ولیم جیمز اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں انقلابی نوعیت کی تبدیلی اجتماعی حرکت سے آتی ہے۔ مگر اس کے پیچھے ایک موثر اور طاقت ور شخصیت کا ہونا لازم ہے اور وہ کام جو قوتیں ۵۰ سال کی اجتماعی حرکت سے کرتی ہیں‘ وہی ایک موثر شخصیت محض ۵۰ ماہ یا ۵۰ دنوں میں انجام دینے کی اہلیت

رکھتی ہے، بشرطیکہ وہ ان کی راہنمائی مثبت سمت کی جانب کرے۔

اس فلسفے کی دلیل کے طور پر پروفیسر محمد منور اقبال کی فکری و عملی کاوشوں کی داستان بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ امت مسلمہ کے زوال کا دور تھا اور مسلمان انگریزوں کے استعماری ہتھکنڈوں کا شکار تھے۔ حالی، اکبر الہ آبادی اور سر سید نے سب کچھ دیکھ کر مسلمانوں کو خبردار کیا اور فتنے سے بچنے کی ترغیب دلائی، مگر بقول پروفیسر محمد منور: ''حق یہ ہے کہ خدمت اور اصلاح کے آگے ہمت نہ تھی، لہٰذا وہ دوبارہ توحید کے ہر نغمے پر غالب آ جانے کا انقلاب آفریں پیغام نہ دے سکے۔''

یہ اعزاز صرف اقبال کو حاصل ہے کہ انھوں نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی ذمہ داری لی تھی کہ صحرا سے نکل کر روما کی سلطنت کو الٹ دینے والی امت اب پھر ہوشیار ہونے کو ہے اور اس کی راہبری وہ خود کریں گے۔ حالات رو بہ زوال تھے، مگر علامہ پھر بھی توحید کے نغمے الاپ رہے تھے:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے[۹۵]

ایسی شخصیت میں وہ تمام عناصر موجود ہوتے ہیں جو صرف مخالف کا وار سہنے کی برداشت ہی نہیں رکھتے، بلکہ وہ مخالف سے ٹکر لینے اور اس کو مسخر کر لینے کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس منفی مقاصد کے حامل افراد معاشروں میں جس چنگیزی انقلاب کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، ان کی فتوحات میں ایک نمایاں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسے افراد اور ایسے انقلابی مناظر ناپائیدار ہوتے ہیں۔ پروفیسر محمد منور: ان دونوں گروہوں کو گروہِ آدم گر اور گروہِ غارت گر سے موسوم کرتے ہیں۔ ایک گروہ پیغمبری روح کا وارث ہے اور دوسرا گروہ ابلیسی روش کا وارث۔

زیرِنظر مقالے میں جناب پروفیسر صاحب نے فرزندِ اقبال کی طرف اشارہ کر کے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں ان کی یہ رائے ناقص ہے کہ ان حالات میں اقبال پاکستان چھوڑ کر چلے جاتے' یا اس افراتفری اور پریشانی کو دیکھ کر شاید خودکشی کر لیتے ۔مرزا صاحب کے خیال میں یہ بات اقبال کی شخصیت اور پیغام سے بالکل مختلف ہے ۔اقبال نے جو فکری عمل کا راستہ دکھایا تھا' اس کی روشنی ہی میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا وجود ممکن ہو سکا۔ یہ اقبال کی انفرادی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

❑ علامہ اقبال اور صوفیہ کرام

زیرِنظر مقالے میں صوفیہ کرام سے علامہ اقبال کا ارتباط واضح کیا گیا ہے۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ اقبال کو صوفیہ سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔

مرزا صاحب نے پہلے تو لفظ صوفیہ کی کچھ وضاحت کی ہے' کہتے ہیں: جس طرح کلامِ اقبال میں عجم' اور عرب محض اصطلاحات ہیں' عجم سے مراد صرف ایرانی افکار نہیں اور نہ عرب سے مراد محض عرب کی سرزمین یا اس کے خصائص ہیں ۔اسی طرح صوفیہ سے اقبال کی مراد بھی محض خلوت نشین ہستی اور زہد و ورع کے پیکر افراد نہیں ہیں، بلکہ اقبال کے نزدیک صوفی وہ فرد ہے' جو مرجع خلائق ہو۔ اگر اس کو کنارہ کش بھی ہونا پڑے تو تھوڑی دیر کے لیے باطنی اور روحانی بالیدگی حاصل کرنے کے لیے تارک الدنیا ہو' مگر اس کے بعد دنیا ہی میں موجود رہے اور تدریس و تبلیغ میں مگن ہو کر اپنے فرائض انجام دے اور اسلامی تعلیمات کا مصدر و منبع اور اسلامی اخلاق کا نمونہ ہو۔ ایسے ہی صوفی کے بارے میں 'ساقی نامہ' میں کہتے ہیں:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا' حمیت میں فرد۹۶

بقول مرزا صاحب اقبال درحقیقت اس شعبے کے زوالِ رساں اور بوسیدہ اجزا سے

گریزاں تھے۔وہ انحطاط پذیر اور انحطاط خیز بعض ایسے امور سے متنفر تھے‘ جو تصوف میں داخل ہو گئے تھے۔(ص ۲۹۳) یہ صوفیہ اسلامی تصوف سے ناآشنا تھے اور تصوف کے اخلاقی پہلو کا ان کی سیرتوں پر کوئی اثر نہ تھا جبکہ اقبال کی آنکھیں ایسے صوفیہ کو ترستی تھیں جو نظام الدین اولیا کی مانند ہوں۔اسی لیے آپ نے ۱۹۰۵ء میں ہی ’التجاے مسافر‘ میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

لہٰذا اقبال صوفیہ کرام سے شاکی نہ تھے‘ بلکہ ان کے اس ماضی سے خائف تھے جس میں ان کا تصوف زندگی میں مایوسی کا زہر گھول رہا تھا۔پروفیسر منور کہتے ہیں کہ اقبال تو چاہتے تھے کہ صوفیہ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی نہ کریں۔جدید ترین نظریات کی روشنی میں اپنے وابستگان کی رہبری کا حق ادا کریں اور ان کی زندگیاں سنواریں۔(ص ۲۹۸)

❑ پاکستان کا اقبالی وفد، قاہرہ میں

یہ مضمون پروفیسر محمد منور کے سفرنامہ مصر کی مختصر روداد ہے۔بیرون پاکستان یہ آپ کا پہلا سفر تھا۔(ص ۳۰۳) اس سرکاری اقبالی وفد میں ڈاکٹر جاوید اقبال اور پیر محمد کرم شاہ الازہری بھی شامل تھے۔

اس سفر میں مرزا صاحب نے زندگی میں پہلی بار عربی میں تقریر کرنے کی جسارت کی۔(ص ۳۰۶) آپ نے قاہرہ یونی ورسٹی میں یومِ اقبال کے ایک جلسے میں ’کلامِ اقبال پر عربی اثرات‘ کے موضوع پر عربی میں ایک تقریر کی۔مگر پہلی بار تقریر کی وجہ سے آپ یہ ضرور کہتے رہے کہ معانی آپ خواتین وحضرات ٹھیک سمجھ جائیں گے‘ مسلمانوں کے دل باہمی مفہوم خوب سمجھتے ہیں‘ ہاں صرف ونحو گھر جا کے درست فرما لیجیے۔(ص ۳۰۷)

ایک محفل اصدقاء اقبال (یارانِ اقبال) کے تحت منعقد ہوئی۔ اسی طرح قاہرہ یونی ورسٹی، الازہر اور عین شمس یونی ورسٹی میں بھی گئے۔ سب سے بڑی تقریب مصر کے ایک وزیر محمد الاحمد' ابوالنور کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ انھوں نے اپنے شعبۂ اوقاف کی گورننگ باڈی میں پاکستانی وفد کے تینوں ارکان کو شامل کرلیا۔ اسی طرح مختلف اہم افراد سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تقاریب میں شرکت اور اہم مقامات کی زیارت بھی ہوگئی۔

پروفیسر محمد منور بتاتے ہیں کہ وہاں جاوید اقبال کو فرزندِ اقبال ہونے کے ناطے بہت عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مصر میں اقبال کے بارے میں گرم جوشی کے جذبات پائے جاتے ہیں' آپ کے خیال میں مصر میں اقبال کے ضمن میں کام کرنے کی بڑی گنجایش موجود ہے۔ وہاں ڈاکٹر جاوید اقبال کو ہمیشہ 'ڈاکٹر جاوید محمد اقبال' کہہ کر متعارف کرایا جاتا رہا۔ جاوید اقبال اس قدر متاثر ہوئے کہ بار بار کہتے تھے کہ قاہرہ میں تو باقاعدہ ایک اقبال سیکریٹریٹ بننا چاہیے۔ (ص ۳۱۰)

❑ قومی اتحاد تو اتحادِ عقیدہ پر مبنی ہے

۶۸۔۱۹۶۷ء میں مصری چار رکنی وفد کے سربراہ ڈاکٹر یحییٰ الخشاب کے ساتھ ایک نشست کی روداد اس مضمون کا موضوع ہے۔ یحییٰ الخشاب' قاہرہ کے الجیزہ آرٹس کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل تھے۔ ان کے اعزاز میں دیے گئے ایک عشائیے میں ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو معلومات افزا ہے۔ اس نشست میں چودھری محمد علی صاحب (سابق وزیراعظم پاکستان)' نذیر احمد خاں' میاں امیر الدین' سپریم کورٹ کے ایک جج' ڈاکٹر جاوید اقبال اور مجید نظامی صاحب کے ہمراہ مرزا محمد منور صاحب بھی موجود تھے۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی کامیابی نے امتِ مسلمہ میں اسلام اور پاکستان کا نام بلند کر دیا مگر دو سال بعد ہی عربوں نے ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقابلے میں جو ہزیمت اٹھائی، اس حوالے سے ڈاکٹر یحییٰ سے مختلف سوالات کیے گئے۔ گو ڈاکٹر یحییٰ الخشاب سرکاری وفد کی حیثیت سے یہاں آئے تھے، مگر انھوں نے حکومت مصر کی مسموم پالیسیوں کے خلاف برملا باتیں کیں۔ آپ کے خیال میں ہماری ناکامی کی وجہ اسلام کے برخلاف سوشلزم سے لگاؤ ہے۔ سوشلزم کی وجہ سے ہم اتحادِ قومی سے بھی محروم ہو گئے۔ اور اس کے نتیجے میں فکری انتشار کا شکار ہو گئے۔ اب، جب تک اتحادِ عقیدہ نہ ہو گا اس وقت تک اتحادِ قومی بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ ڈاکٹر یحییٰ الخشاب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہماری ذلت آمیز شکست کا سب سے بڑا سبب روس ہے۔ جس نے بظاہر دوستی کی، مگر مشکل وقت میں ہمیں تنِ تنہا چھوڑ دیا اور ہمارے پر کاٹ دیے تا کہ ہم جال کے اندر بھی نہ پھڑ پھڑا سکیں۔

اس ساری صورتِ حال سے مرزا صاحب کے ذہنِ رسا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک مسلمان ملک کو امریکہ یا روس یا کسی اور کے معاہدوں، دوستی یا تعاون پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ امتِ مسلمہ کی اصل قوت باہمی اتحاد میں ہے اور یہ اتحاد اس وقت نصیب ہوتا ہے جب اسلام کو خلوصِ نیت کے ساتھ زندگی کا حقیقی لائحہ عمل بنا لیا جائے
۔

❑ جمہوریہ شام میں یومِ اقبال کی تقاریب

یہ مضمون مصنف کے دورۂ شام کی روداد ہے۔ اس دورے میں حسبِ پروگرام مختلف مقامات کی زیارت کے ساتھ ساتھ بہت سے افراد سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور مختلف اداروں میں تقاریر کا موقع ملا۔ یومِ اقبال کی ایک تقریب میں مرزا صاحب

نے اخوتِ اسلامی کے موضوع پر گفتگو کی‘ اسی طرح مرزا صاحب نے شام کی حکومت کے زیرِ اہتمام یومِ انقلاب برائے اہلیتِ اشتراک‘ کی تقریب میں بھی تقریر کی۔

آپ نے مختلف مواقع پر اقبال کے نقطۂ نظر اور ان کے افکار کی وضاحت کی اور بتایا کہ حضرت علامہ کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ امتِ مسلمہ متحد ہو جائے اور کسی نہ کسی انداز میں اسلام کی سربلندی کے لیے مل جل کر کام کیا جائے۔ یہ آپ کی فکری ذکاوت اور وسعتِ نگاہ تھی‘ نیز آپ اسلام کو بالکل اقبال کے زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے‘ لہٰذا ہر جگہ اسلام کو مجموعی اور بین الاقوامی حیثیت سے ابھارنے اور نمایاں کرنے کی کاوش کرتے رہتے تھے۔

قرطاس اقبال: مجموعی جائزہ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا یہ کتاب مرزا محمد منور کی وفات سے قریباً دو سال قبل شائع ہوگئی۔ ایقانِ اقبال‘ میزانِ اقبال اور برہانِ اقبال کے برعکس یہ کتاب مختصر اور ہلکے پھلکے تنقیدی و فکری نوعیت کے تیس مضامین پر مشتمل ہے۔

ان مضامین کے موضوعات اقبال کے مختلف فکری‘ عملی اور انقلابی پہلوؤں سے متعلق ہیں مگر اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام مضامین حالات حاضرہ کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں۔ پروفیسر محمد منور صاحب کا دل فطرت شناس‘ کسی بھی موضوع کو محض علمی سطح تک محدود نہیں رکھتا۔ اکثر اوقات وہ موضوع کو عملی حوالوں سے مربوط کر دیتے ہیں اور یوں وہ موضوع باعمل بن جاتا ہے۔

پروفیسر محمد منور کے نزدیک فکرِ اقبال‘ شارٹ کٹ ہے۔ مندرجہ بالا تحریریں انھوں

نے جس جذبے سے معمور ہو کر لکھی ہیں‘ وہ یہی ہے کہ آپ ایک طرف تو اقبال کو ایک شاعر‘ مفکر اور فلسفی کے روپ میں پیش کرتے ہیں ۔ برہانِ اقبال‘ ایقانِ اقبال‘ اقبال کی فارسی غزل اور میزان اقبال اسی پہلو سے متعلق ہیں ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آپ فکرِ اقبال کے ایسے موضوعات پر بھی بحث کرتے ہیں جن کے ذریعے سے عصرِ حاضر میں قوم کو ایک ٹھوس اور قابلِ عمل لائحہ عمل دیا جا سکے ۔

پروفیسر صاحب نے خالص اقبالی افکار پر بات کرتے ہوئے ایسے نکتے اٹھائے ہیں کہ قارئین کچھ سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

زیرِ نظر کتاب میں، اپنی دیگر علمی تصانیف کے برعکس مرزا صاحب کا اسلوبِ تحریر نسبتاً ہلکا پھلکا ہے یعنی زیادہ علمی اور ٹھوس نہیں ہے ۔ یہ مضامین نسبتاً مختصر ہیں ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مضامین خالص ’عوامی‘ ضرورت اور حالات کے پیش نظر لکھے گئے ۔ کیونکہ یہ تمام مضامین اخبارات میں شائع ہوئے ۔ بعدازاں انھیں ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا گیا ہے ۔ ان کا پس منظر بھی یہی ہے کہ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: ”پروفیسر محمد منور کی طویل معلمانہ زندگی اور ان کی جملہ تگ و تازبھی‘ علامہ اقبال کے انھی مقاصدِ خاص‘ اسی خدمتِ دین اور ملت اسلامیہ کی سرفرازی و سربلندی کی خواہش و تمنا پر مرکوز رہی ۔“ (ص ۲)

مرزا صاحب کے نزدیک فکرِ اقبال کو عام کرنے کا ایک اہم مقصد عوام الناس کی فکری و عملی تربیت کی کاوش کرنا بھی تھا اور اس کتاب کے مضامین دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی یہ کتاب‘ متذکرہ مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے ۔

☆☆☆

حوالے و حواشی

۱۔پروفیسر محمد منور'میزانِ اقبال' دیباچہ'ص ۱۶۔

۲۔پروفیسر محمد منور'ایقانِ اقبال' دیباچہ'ص ۴۔

۳۔میرزا ادیب'روزنامہ نوائے وقت'لاہور'۲۳ نومبر ۱۹۸۹ء۔

۴۔علامہ اقبال'بالِ جبریل'ص ۱۱۔

۵۔"" ص ۴۹۔

۶۔علامہ اقبال'ضربِ کلیم'ص ۶۰۔

۷۔علامہ اقبال'بالِ جبریل'ص ۹۷۔

۸۔"" ص ۹۴۔

۹۔"" ص ۲۸۔

۱۰۔"" ص ۱۶۸۔

۱۱۔میرزا ادیب'روزنامہ نوائے وقت'لاہور'۲۳ نومبر ۱۹۸۹ء۔

۱۲۔قرآن مجید'سورۃ الحج'آیت ۴۶۔

۱۳۔علامہ اقبال'ضربِ کلیم'ص ۷۹۔

۱۴۔"بالِ جبریل'ص ۱۴۔

۱۵۔"ارمغانِ حجاز'ص ۶۵۔

۱۶۔"بالِ جبریل'ص ۲۸۔

۱۷۔"ضربِ کلیم'ص ۲۶۔

۱۸۔عاشق حسین بٹالوی'منشوراتِ اقبال'ص ۱۲۳۔

۱۹۔علامہ اقبال'بالِ جبریل'ص ۶۳۔

۲۰۔"ضربِ کلیم'ص ۳۱۔

۲۱۔"تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'ص ۱۸۴۔

۲۲۔"بانگِ درا"، ص ۱۶۱، ۱۶۲۔

۲۳۔"" ص ۲۴۸۔

۲۴"رموزِ بےخودی"، ص ۹۲۔

۲۵۔" پیامِ مشرق"، ص ۵۲۔

۲۶۔"ارمغانِ حجاز"، ص ۴۹۔

۲۷۔"بالِ جبریل"، ص ۹۰۔

۲۸۔"جاوید نامہ"، ص ۶۵۔

۲۹۔"بالِ جبریل"، ص ۳۹۔

۳۰۔"بانگِ درا"، ص ۱۸۰۔

۳۱۔"بالِ جبریل"، ص ۲۳۔

۳۲۔"" ص ۱۷۔

۳۳۔"" ص ۴۸۔

۳۴۔میرزا ادیب، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۰ جون ۱۹۹۱ء۔

۳۵۔علامہ اقبال، اقبال نامہ، اوّل ص ۳۴۳۔

۳۶۔ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اور فارسی شعرا، ص ۱۸۶۔

۳۷۔پروفیسر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۳۹۳۔

۳۸۔علامہ اقبال: مقالاتِ اقبال۔ مرتب: سید عبدالواحد معینی، ص ۱۶۷۔

۳۹۔"اقبال نامہ، دوم، ص ۵۳۔

۴۰۔پروفیسر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۳۹۰۔

۴۱۔علامہ اقبال، اقبال نامہ، اوّل، مرتب: شیخ عطاء اللہ، ص ۴۴، ۴۵۔

۴۲۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۴۳۲۔

۴۳۔"""ص ۳۷۶۔

۴۴۔ڈاکٹر محمد ریاض‘ اقبال اور فارسی شعرا‘ص ۱۷۴۔

۴۵۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن‘ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ‘ص ۴۱۶۔

۴۶۔"""ص ۴۵۴۔

۴۷۔ڈاکٹر محمد ریاض‘ اقبال اور فارسی شعرا‘ص ۵۰۔

۴۸۔یوسف حسین خاں‘ حافظ اور اقبال‘ص ۱۵۔

۴۹۔"""ص ۱۵۔

۵۰۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن‘ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ‘ص ۴۲۲۔

۵۱۔ڈاکٹر محمد ریاض‘ اقبال اور فارسی شعرا‘ص ۲۵۵۔

۵۲۔حمید احمد خاں‘ اقبال کی شخصیت اور شاعری‘ص ۸۲۔

۵۳۔علامہ اقبال‘شذراتِ فکرِ اقبال‘مترجم: افتخار احمد صدیقی‘ص ۱۰۵۔

۵۴۔ڈاکٹر سید عبداللہ‘اوصافِ اقبال‘مرتبہ: بہار الہ آبادی‘ص ۱۴۸‘۱۴۹۔

۵۵۔"""ص ۱۶۶۔

۵۶۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن‘ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ‘ص ۴۴۱‘۴۴۲۔

۵۷۔ڈاکٹر محمد ریاض‘ اقبال اور فارسی شعرا‘ص ۱۵۰۔

۵۸۔علامہ اقبال‘ اقبال نامہ (اول)‘ص ۳۴۳۔

۵۹۔علامہ اقبال، اسرارِ خودی‘ص ۱۱۔

۶۰۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن‘ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ‘ص ۴۲۸۔

۶۱۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں‘ حافظ اور اقبال‘ص ۳۵۔

۶۲۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی‘اوصافِ اقبال‘مرتبہ: بہار الہ آبادی‘ص ۳۰۷۔

۶۲ا۔رومی عصر‘ص ۱۵۵بحوالہ: تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ‘ص ۷۵۔

۶۳۔ڈاکٹر عبدالشکور احسن' اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ' ص ۴۷۸۔

۶۴۔ڈاکٹر محمد ریاض' برکاتِ اقبال' ص ۲۳۱۔

۶۵۔علامہ اقبال' تشکیلِ جدید الہیات اسلامیہ' ص ۲۱۲۔

۶۶۔" بالِ جبریل' ص ۸۔

۶۷۔" بانگِ درا' ص ۲۷۱۔

۶۸۔" بالِ جبریل' ص ۲۲۔

۶۹۔" " ص ۸۷۔

۷۰۔فقیر سید وحیدالدین' روزگارِ فقیر' اوّل' ص ۲۰ تا ۲۱۔

۷۱۔علامہ اقبال' ارمغانِ حجاز' ص ۹۴۔

۷۲۔" بالِ جبریل' ص ۷۸۔

۷۳۔" اسرار و رموز' ص ۱۲۳۔

۷۴۔" اقبال نامہ' حصہ اوّل' ص ۳۶۱ اور ۳۶۲۔

۷۵۔" " ص ۳۶۱۔

۷۶۔پروفیسر محمد منور' سیارہ ڈائجسٹ' دسمبر ۱۹۹۰ء' ص ۲۵۔

۷۷۔علامہ اقبال' بانگِ درا' ص ۱۴۱۔

۷۸۔" پیامِ مشرق' ص ۱۹۲۔

۷۹۔" اسرار و رموز' ص ۱۲۳۔

۸۰۔" بالِ جبریل' ص ۷۵۔

۸۱۔" ارمغانِ حجاز' ص ۵۰۔

۸۲۔" ضربِ کلیم' ص ۳۵۔

۸۳۔محمد احمد خاں' اقبال اور مسئلہ تعلیم' ص ۳۸۹' ۳۹۰۔

۸۴۔علامہ اقبال، بانگِ درا، ص ۱۴۲۔

۸۵۔"اسرار و رموز"، ص ۱۱۔

۸۶۔علامہ اقبال، خطوطِ اقبال، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، ص ۱۶۵، ۱۶۶۔

۸۷۔"بالِ جبریل"، ص ۴۹۔

۸۸۔قرآن مجید، سورہ ص، آیت ۷۲۔

۸۹۔علامہ اقبال، اسرارِ خودی، ص ۱۸۔

۹۰۔"زبورِ عجم"، ص ۵۱۔

۹۱۔"پیامِ مشرق"، ص ۱۳۲۔

۹۲۔"بانگِ درا"، ص ۱۴۲۔

۹۳۔"ضربِ کلیم"، ص ۱۱۳۔

۹۴۔"بالِ جبریل"، ص ۱۴۔

۹۵۔"بانگِ درا"، ص ۱۹۵۔

۹۶۔"بالِ جبریل"، ص ۱۲۴۔

باب نمبر چہارم
پروفیسر محمد منور کا اقبالیاتی سرمایہ
(انگریزی)

جیسا کہ گذشتہ ابواب میں ذکر آ چکا ہے' پروفیسر محمد منور نے ایک بھرپور اور فعال زندگی گزاری۔ ان کی تدریسی' علمی' تحریری اور تقریری سرگرمیوں کا ایک بڑا مقصد علامہ اقبال کے پیغام اور فکر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا تھا۔ گو وہ اردو کے علاوہ عربی' فارسی اور انگریزی زبانیں بھی بخوبی جانتے تھے' تاہم تصنیف و تالیف کا زیادہ تر کام انھوں نے اردو میں کیا۔

انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ مشرق اور برعظیم پاکستان اور بھارت میں بھی انگریزی سمجھنے اور پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔ فکرِ اقبال کو اس حلقے تک پہنچانا' پروفیسر محمد منور کے مقاصدِ حیات میں شامل تھا۔ بلکہ ایک اعتبار سے اقبال کے پیام کو انگریزی قارئین تک پہنچانا نسبتاً زیادہ ضروری تھا۔ کیونکہ انگریزی خواں طبقہ زیادہ تر انگریزی ذریعۂ تعلیم (English Medium) کی درس گاہوں کا تعلیم یافتہ تھا' جہاں دین و مذہب و ملت اسلامیہ' پاکستان' قائد اعظم اور علامہ اقبال جیسے موضوعات کا ذکر نسبتاً کم ہی ہوتا ہے۔

اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انگریزی خواں طبقے پر اقبال کے افکار و تصورات واضح کیے جائیں۔ پروفیسر محمد منور صاحب نے اس مشکل لیکن اہم کام کا بیڑا اٹھایا۔ افکار اقبال کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں بیسیوں مضامین لکھے (بعض مضامین پر ان کے دوستوں نے نظر ثانی بھی کی)۔

انگریزی زبان میں محمد منور کا اقبالیاتی سرمایہ زیرِ نظر باب کا موضوع ہے۔ انگریزی

میں اقبالیات پر ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

1981 Iqbal and Quranic Wisdom -1

1985 Iqbal: Poet and Philosopher of Islam 2-

1986 Dimensions of Iqbal 3-

2001 Iqbal on Human Perfection 4-

اب ہم ان کتابوں کا تعارف اور تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

IQBAL AND QURAINC WISDOM

اقبال اور حکمتِ قرآنی

پہلی مرتبہ یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ ۹ مضامین پر مشتمل ہے مصنف نے اپنے بعض اردو مضامین کے مطالب کو یہاں انگریزی میں بیان کیا ہے، مثلاً:

Iqbal on Quranic Concept of History برہانِ اقبال میں اور Iqbal on Life after Death ایقانِ اقبال میں موجود ہیں۔ ایک مضمون Iqbal`s Idea of Taqdir ایقان اقبال میں شامل 'اقبال کا تصورِ تقدیر' کے مفہوم سے بہت قریب ہے۔ خیالات وہی ہیں مگر ترتیب قدرے مختلف ہے۔ اسی طرح سے Harmony in Iqbal`s Thought میزان اقبال میں شامل مضمون توازن: اقبال کی شاعری کا ایک پہلو' کا خلاصہ ہے۔

آپ نے علامہ اقبال کے قرآنی افکار کو اس سے قبل اردو میں بھی مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے اور اب اس کتاب میں بھی انھوں نے قرآن کے الفاظ کے حوالے سے اقبال کے مختلف نظریات کو انگریزی میں پیش کیا ہے' کیونکہ آپ کے خیال میں:

The main source of inspiration for Allama Iqbal

is the Holy Quran and the Sunnah of the Holy Prophet (P.B.U.H). He believes in the fact that man can realize fully his potentialities only through abiding by the commandment's of Allah, and following the illustrious example of the Holy Prophet in all aspects of life (P.8)

علامہ اقبال کے ہاں قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی زندگی میں سب سے بڑا محرکِ فکر و عمل ہے۔ درحقیقت وہ سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی (خفتہ) صلاحیتوں سے صرف اسی صورت میں آگاہ ہوسکتا ہے کہ وہ احکاماتِ الٰہی پر کاربند ہو اور زندگی کے تمام تر پہلوؤں میں رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرے۔(ص ۸)

کتاب کا تعارف معروف قانون دان اور دانش ور جناب اے کے بروہی نے تحریر کیا ہے۔ان کے خیال میں علامہ اقبال کے پیغام سے روشنی حاصل کرنے والے اہلِ دانش میں پروفیسر محمد منور سرِفہرست ہیں۔(ص ۱) وہ کہتے ہیں کہ افلاطون کو سقراط سے جو تعلق تھا، وہی تعلق مرزا منور کو اقبال سے ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ علامہ اقبال اور پروفیسر محمد منور دونوں کے تصورات کا ماخذ ایک ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ ذیل میں اس کتاب کے مضامین کا تعارف پیش ہے:

❑ Harmony in Iqbal`s Thought اقبال کے ہاں توازن وہم آہنگی

کائنات اور انسان دونوں کا قیام ایک توازن کی وجہ سے ممکن ہوسکا ہے۔انسان اپنے وجود اور اعمال و افعال میں نظم قائم کر کے اپنی زندگی کو بہتر انداز سے بسر کرسکتا ہے۔اقبال نے تضادات کے ذریعے سے چیزوں کی اصل حقیقت کو سمجھایا ہے۔

اقبال کے 'مردِ مومن' سے ہم ان کے توازن کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مردِ مومن حقیقت میں وہ ہے جو گفتگو کے وقت نرم ہوتا ہے اور جستجو کے وقت سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔

یہ مضمون پروفیسر محمد منور کے مضمون 'توازن' اقبال کی شاعری کا ایک پہلو' مشمولہ میزانِ اقبال کی ایک مختصر شکل ہے۔

Iqbal's Idea of Faqrq اقبال کا تصورِ فقر

فقیر عام مفہوم میں تو ایک مفلوک الحال' درماندہ اور ٹھکرایا ہوا شخص ہوتا ہے۔لیکن اقبال کے نزدیک فقر ایک دوسری ہی کیفیت کا نام ہے۔پروفیسر محمد منور نے اس مضمون میں فقیر کی ایسی ہی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔انھوں نے اقبال کی شاعری سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ فقیر' عاجز اور سائل کے معنی میں نہیں ہے بلکہ وہ شخص ہے جو دنیا کے مال ومتاع کو حقیر سمجھ کر خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے۔دنیا سے الگ تھلک رہنے والا شخص فقیر نہیں ہے بلکہ وہ سوز وسازِ رومی اور پیچ وتاب رازی کی تفسیر ہے۔

اقبال نے ایسے فقیر کی جتنی خصوصیات بیان کی ہیں'ان کے مطابق راہب فقیر نہیں ہے' کیونکہ اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔پروفیسر محمد منور نے ماضی کے فقیر' صوفی اور درویش حضرات کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ غیر معمولی علم کے حامل ہوتے'لوگوں کو شریعت کی طرف مائل کرتے اور کتابیں تحریر کرتے تھے۔وہ زندگی کی مقصدیت کے قائل تھے'بقول اقبال:

سکون پرستیِ راہب سے فقر ہے بے زار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

ایسے فقیروں کے سامنے دنیا کی ساری دولت کے ڈھیر بھی لگا دیے جائیں تو اس سے بے زاری ظاہر کریں گے۔اقبال نے مسجدِ قرطبہ میں ایسے فقیروں کی شان بیان کی

ہے کہ یہ مردانِ حق اور عربی شہسوار خلقِ عظیم کے مالک تھے۔ صاحبِ صدق و یقین تھے۔ پروفیسر محمد منور نے شیخ احمد سرہندی کی مثال دی ہے کہ ان جیسے عظیم عالم اور فقیر نے شہنشاہ نور الدین جہانگیر کی اطاعت قبول نہ کی اور جیل جانا پسند کیا۔ جب تک مسلمانوں میں اللہ والے موجود رہے ان کے معاشرے تو انا رہے:

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ ۲

اقبال فقیر کو ملا اور صوفی سے برتر مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ فقیر مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں اور فکر و عمل کے نئے زاویے وا کرتے ہیں۔

۲۸/اشعار اور ایک درجن سے زائد قرآنی آیات کے ذریعے سے پروفیسر محمد منور نے اقبال کے تصورِ فقر کی بخوبی وضاحت کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غنیٰ' تقویٰ اور فقر کی کمی کی وجہ ہی سے مسلمان زوال کا شکار ہیں۔

Iqbal and Quranic Concept of History اقبال اور قرآن کا تصور تاریخ

میزانِ اقبال میں ایک مضمون ہے: 'قرآنی تصور تاریخ اور علامہ اقبال' زیر نظر مضمون میں اسی مضمون کے مفاہیم و مطالب کو انگریزی میں بیان کیا گیا ہے اس لیے انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

[اقبال کا تصور حیات بعد الموت] Iqbal on Life after Deathq

یہ مضمون آپ کی کتاب ایقانِ اقبال (ص ۹۵' ۱۲۰) میں ہے جو اسی نوعیت کے مطالب پر مبنی ہے۔

[اقبال کا تصورِ تقدیر] Iqbal's idea of Taqdirq

'علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر' کے عنوان سے ایک مضمون ایقانِ اقبال میں شامل ہے۔ زیرِ نظر مضمون اس کا انگریزی روپ ہے۔

Iqbal on Advancement Sans Morals[اقبال اور بلا اخلاقیات ترقی]

زندگی آرام یا صرف حصولِ مسرت کے لیے نہیں ہے بلکہ زندگی انسان کے پاس موجود ایسا سرمایہ ہے جس کے صحیح استعمال سے انسان بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ زندگی اخلاقی قواعد و ضوابط کے ساتھ معیاری اور بے مثال بن سکتی ہے۔آج کے انسان نے ٹکنالوجی میں اپنی ذہانت سے مہارت حاصل کر لی ہے' مگر اس کے پس منظر میں مادہ پرستانہ سوچ کارفرما ہے۔مغرب نے مادی اصول کے تحت ہی ترقی کی ہے۔اقبال کے خیال میں مغرب کو افراد سے زیادہ اشیا کی ساخت و بناوٹ اور حفاظت سے دلچسپی ہے۔انسانیت کو جس تہذیب کی ضرورت ہے' اس کی فکر کسی کو نہیں ہے۔اس لیے ان کے ہاں ٹکنالوجی کی ترقی ہو رہی ہے' مگر انسانیت کی نہیں۔ (ص ۱۰۶)

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال نے اس نقطہ نظر کو اپنی نظم اور نثر دونوں میں بیان کیا ہے کہ مادی طور پر انتہائی خوش حال قومیں بھی انسانی رویے سے عاری ہیں۔اقبال کا اصرار ہے کہ انسان پہلے اپنی ذات کو پہچانے' تب ہی وہ تسخیرِ کائنات کے اولین مراحل طے کر سکتا ہے۔جو شخص اپنی خودی کو نہ پہچان سکے' وہ کسی دوسرے کی 'خودی' 'انا' اور 'مساوی حقوق' کو نہ تو سمجھ سکتا ہے نہ اسے برابر کے حقوق دے سکتا ہے۔(ص ۱۰۹)

لیکن 'خودی' کی شناخت اور تربیت نظریاتی طور پر ممکن نہیں ہے۔جس طرح ایک موچی صرف نظریاتی تربیت سے جوتے تیار کرنے والا نہیں بن سکتا' یہی حال خودی کی تربیت چاہنے والے فرد کا بھی ہے۔اس کے لیے اسے بہت کچھ کرنا ہوگا۔

انسان کا عزم اس کے رویے کو بہتر بناتا ہے' لیکن عزم بھی عقیدے کی مضبوطی کے

بغیر بے کار ہے۔ اسی بنیاد پر معاشرے کی غالب اکثریت خیر کے راستے پر گامزن ہوسکتی ہے۔ اس سے پروفیسر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ افراد سے معاشروں کی اصلاح ہوتی ہے' نہ کہ معاشرے' افراد کی اصلاح کرتے ہیں۔ (ص ۱۱۵)

الغرض خودی کی اصلاح' تربیت اور بہتری کے لیے فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے' کیونکہ ایک فرد کی خود احتسابی اس کے 'آج' پر اثر انداز ہوگی اور اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ایک فرد کا 'آج' معاشرے اور پھر پوری انسانیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فیثا غورث کے نزدیک انسان ایک چھوٹی کائنات ہے' لٰہذا فرد کے عمل کے بڑے دور رس اثرات ہیں' بقول اقبال:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف۳

□ Iqbal on Realisation of Self اقبال اور خودی کا احساس

جانور محدود حیات کے مالک ہوتے ہیں۔ جبکہ انسان کو اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ ایک مغربی مفکر ولیم ٹمپل کے مطابق انسان کو اس قدر صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں' محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہی کائنات کا مالک ہے۔ (ص ۱۱۹)

انسان کو علم کے ساتھ 'ذہن' بھی عطا کیا گیا ہے اور ذہن بہت بڑی نعمت ہے۔ قرآن کے مطابق انسان کے اندر حیوانیت موجود ہے۔ (۲۲:۸) اور جب تک اس کی تربیت نہ کی جائے' وہ برائی پر آمادہ رہتا ہے۔ خودکشی کرنے والوں میں بھی یہی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ حیوانی اور سفلی خیالات انسان کو اس حد تک گمراہ کرتے ہیں کہ آج کے زمانے کی ظاہری روشنی ان کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اور وہ اپنے حیوانی جذبات کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ تہذیبی گمراہی

ہے، جس نے آج کے پڑھے لکھے عام انسان کو بھی کردار کے لحاظ سے بلندی عطا نہیں کی بلکہ وہ دلدل میں پھنستا چلا جا رہا ہے۔ آج کی تہذیب، آزادی تو دیتی ہے مگر بقول اقبال:

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری ۴

پروفیسر محمد منور کے نزدیک اقبال نے اس تہذیب حاضر سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ بتایا ہے کہ وہ قانونِ الٰہی کا اتباع کرے کیونکہ خدا ہی انسان کی زندگی کے صحیح استعمال کا راستہ بتانے والی ذات ہے۔ پھر انسان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ایک کل (کائنات) کا جزو ہے۔ لہٰذا اسے اپنا آپ دریافت کرنا ہے۔ جب وہ اپنی ذات (جزو) کو دریافت کر لے گا تو 'کل' کو دریافت کرنا (یعنی کائنات کو تسخیر کرنا) بہت آسان ہو جائے گا۔ اگر وہ اپنی زندگی کے سفلی پہلوؤں کے گرداب میں پھنسا رہے گا تو وہ شناخت سے محروم رہے گا۔ (ص ۱۲۵)

Iqbal on Man's Quest for the object Worthy of Human Worship q

اقبال، انسانیت کے لیے لائق عبادت مرکز کی تلاش میں

ہر انسان کسی ایسی ہستی کی تلاش میں رہتا ہے جو اس سے برتر ہو۔ اسے تحفظ فراہم کر سکے اور اس کو ذہنی و نفسیاتی آسودگی دے سکے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ جو شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے وجود میں کوئی خلا ہے تو آخرکار وہ خدا کی ہستی تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ (ص ۱۲۹)

پروفیسر محمد منور وضاحت کرتے ہیں کہ خدا کا قانون انسان کی فطرت کے لیے بہترین راستہ ہے۔ اس قانون کے ذریعے وہ اپنے فرائض، ذمہ داریوں، پسند اور

ناپسند کو جانچ سکتا ہے۔ نہ صرف اپنی ذمہ داریاں بلکہ دوسروں کے حقوق بھی۔ اور اسی طرح وہ فطری انداز میں اپنی ذات کی تربیت کرتا چلا جاتا ہے' کہ اسے شریعت کے یہ ضابطے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتے۔ گویا کہ اس کی فطرت خود اس 'قانون' کی متلاشی تھی' اور انتظار میں تھی کہ اس کو سنوار کر سامنے لایا جائے۔ اسی وجہ سے قرآن اور سنت راہنمائی کے لیے پختہ ذرائع ہیں' لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر 'ضبطِ نفس' کی صلاحیت پیدا کرے اور اپنے اردگرد کے لوگوں پر بھی اس ضبط کو نافذ کرے' یعنی اپنے آپ پر قابو پانے' اپنے آپ کو منظم کرنے اور اس نظم و ضبط کو معاشرے میں بھی رائج کرے۔ (ص ۱۳۵)

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اقبال نٹشے پر ترس کھاتے تھے کیونکہ وہ شخص خدا کے وجود کو محسوس کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی ذات اس چیز کی متقاضی ہے کہ اسے تربیت ملے' ضابطہ ملے' اور ہر چیز اپنے مقام پر ہو۔ اسی چیز کا نام شریعت ہے۔ اقبال نے شاہ ولی اللہ کی تعریف کی ہے' جنھوں نے امتِ مسلمہ کی کمزوریوں کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کی۔ پروفیسر منور آخر میں کہتے ہیں کہ علامہ نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ نظامِ زندگی کو جو قوتیں چلا رہی ہیں' ہم ان کو یک دم سمجھ نہیں سکتے۔ اس کو ہر لمحے اپنے سامنے راہنمائی کے لیے ایک چراغ کی ضرورت ہے اور وہ چراغ ہے دینِ اسلام۔

❑ Iqbal on Man's Accountability [اقبال اور انسان کا محاسبہ]

مشرق اور مغرب میں انسانیت سے محبت کرنے والے افراد ایسی تجاویز پیش کرتے رہے ہیں جس سے انسانیت کی بھلائی ہو۔ اقبال بھی انسان کے مستقبل کے بارے میں فکرمند نظر آتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ ایک انسان ایک حقیقی انسان اس وقت بن سکتا ہے جب

وہ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرے اور شریعت کی پابندیوں کو تسلیم کرے۔ اقبال اس بات کے قائل ہیں۔ کیونکہ زندگی دینے والا خدا ہی ہے۔ اس کے احکامات مانے بغیر دنیا کی زندگی میں بہتری ممکن نہیں ہے۔ جو شخص صرف اپنے ذاتی مستقبل کو بہتر بنانے کی فکر کرے گا' اس کا طرز عمل 'حیوانیت' ہے۔ صرف اپنی بات پر توجہ دینے سے اس میں خود غرضی کی صفت پروان چڑھتی ہے جب کہ انسان کی ترقی کی معراج یہ ہے کہ اس کی زندگی کا مرکز خدا اور اس کے احکامات ہوں۔ اگر انسان اپنے اندر موجود سفلی صفات سے پاک ہونا چاہتا ہے تو پھر وہ دوسروں کے لیے قربانی' خلوص' ایثار اور خیر سگالی کے جذبات اپنے اندر پیدا کرے۔ فطرت کا نظام یہ ہے کہ وہ فرد کو پنپنے کا موقع بھی دیتی ہے اور معاشرے کے قیام و استحکام کی کوشش بھی کرتی ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور مشیت ہے۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انسان اس صورت میں زندہ رہ سکتا ہے' جب وہ اپنے آپ سے آگاہ ہو۔ اقبال نے اس پر زور دیا ہے کہ جو اپنے آپ سے آگاہ نہ ہو وہ نیکی اور بدی میں کس طرح تمیز کر سکتا ہے۔ قدرت بھی انھی لوگوں کی مدد کرتی ہے جو اپنی روح' کائنات اور خدا سے واقف ہوں' سمجھ دار ہوں۔ اس کی یہی خود احتسابی اقبال کے ہاں مرکزی مضمون ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک' اگر اللہ تعالیٰ کائنات کا مرکز ہیں تو رسالت مآبؐ دنیا کا مرکز ہیں۔ (ص ۱۴۷)

☆☆☆

اقبال: اسلام کا شاعر اور فلسفی

ہیں ۔اسی لیے اقبال نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک ہمہ گیر انداز اختیار کیا' اپنی شاعری سے دلوں میں گداز پیدا کیا اور مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونک دی' اور مسلمان حصولِ وطن کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ۔اسی لیے پروفیسر صاحب کے نزدیک علامہ اقبال:

In this sense, Iqbal was a great conqueror. (P:5)

(اس اعتبار سے اقبال عظیم فاتح تھا،ص ۵)

پروفیسر صاحب اقبال کو Servant of Islam بھی قرار دیتے ہیں ۔(ص ۷) اس عظیم شاعرِ اسلام نے یہ جان لیا تھا کہ اپنے پیغام کو لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنانے کے لیے اسے موثر بنانا نہایت ضروری ہے ۔اسی لیے انھوں نے شاعری کا ایک موثر اندازِ بیان اختیار کیا۔

وہ بتاتے ہیں کہ اس کتاب کے تقریباً نصف مضامین پر پروفیسر آرائے خان نے نظر ثانی کی ہے اور ایک مضمون (ابوالاثر حفیظ جالندھری) ترجمہ کیا گیا ہے۔(ص ۹)

کتاب کے مضمون Impact of Arabic Literature on Iqbal's Poetry میں میزانِ اقبال کے مضمون 'کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات' کے مطالب بیان کیے گئے ہیں ۔ایک اور مضمون Prophet Ibrahim as a Symbol in Iqbal's Poetry. ایقانِ اقبال کے مضمون 'علامہ اقبال اور ابراہیمی نظر' کے مفاہیم کی وضاحت کرتا ہے ۔اسی طرح حفیظ جالندھری کے بارے میں مضمون میزانِ اقبال میں شامل ہے ۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں ہفتہ وار چٹان کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کے تین مضامین ایسے ہیں‘جن میں مرزا صاحب نے اپنے اردو مضامین کے مطالب ومفاہیم کوبعض تراميم اورتبدیلیوں کے ساتھ انگریزی میں پیش کیا ہے۔

- Impact of Arabic Literature on Iqbal's Poetry

کلام اقبال پرعربی ادب کے اثرات

اس مضمون کے مطالب وہی ہیں جومیزانِ اقبال کے پہلے مضمون میں بیان کیے گئے ہیں لہٰذا یہاں اس کے تعارف وتبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

- Prophet Ibrahim as a Symbol in Iqbal's poetry

علامہ اقبال کی شاعری میں حضرت ابراہیمؑ بطور علامت

’علامہ اقبال اورابراہیمی نظر‘کے عنوان سے ایک مضمون ’ایقانِ اقبال میں شامل ہے۔دونوں کے مطالب یکساں ہیں۔

- Iqbal: Man of Faith and Vision اقبال:

ایک صاحبِ عقیدہ وباشعور انسان

ایمان لے آنا ایک چیز ہےاورایمان ویقین ایک بالکل مختلف کیفیت ہے۔ایمان اورعقیدے کے بغیر انسان کی زندگی ایک خالی وجود کی مانند ہے۔ایمان‘ دیگرتمام محبتوں سے بدرجہا بہتر محبت ہے۔پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ جوشخص ایمان لانے کے بعد بھی اپنی شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتا،اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اطلاعاتی نظام پرغور کررہا ہے۔(ص ۵۸)اسی بات کوعلامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الاّ
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی٥

یعنی دل کی گواہی وہ حقیقی پیمانہ ہے‘جس پرایمان کی پرکھ ہوسکتی ہے۔پروفیسر محمد منور

کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر غیر متزلزل ایمان ہی فرد کی پختگی اور استحکام کا باعث ہے۔ قرآن' حدیث اور حکما کے اقوال یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کو دوبارہ ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے اور پھر اس ایمان کی بنیاد پر ہی اس کے اندر ایسے اوصاف پروان چڑھتے ہیں کہ انسان بہت سے ناممکن کام بھی انجام دے سکتا ہے اور ہر برائی کے آگے ایک چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔(ص ۵۹)

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را٦

اقبال اس 'ایمان' کے قائل تھے۔ اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کی آواز توانا ہے اور انھوں نے اس ایمان اور بصیرت کی بنیاد پر بہت پہلے یہ سمجھ لیا تھا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہ آپ کا یقین کامل تھا کہ اسلام کی نشاتِ ثانیہ کے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اقبال نے پیش گوئی کی تھی کہ خضرِ وقت کی آمد بہت قریب ہے اور پروفیسر محمد منور کے مطابق قائداعظم ہی اس زمانے کے 'خضر' ثابت ہوئے' یوں اقبال کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ یہ محض اقبال کی ایمانی بصیرت تھی کہ وہ اس مایوس کن دور میں بھی مسلمانوں کو کھڑا کرنے کے قائل ہوئے۔ اسی لیے پرفیسر صاحب نے اقبال کو Man of Faith and Vision (صاحبِ ایمان و بصیرت) کہا ہے۔

اقبال اور امت کا روشن مستقبل

امتِ مسلمہ، اقبال کا ایک اہم اور مرکزی موضوع ہے۔ جس پر انھوں نے نثر اور نظم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ امت کے مستقبل کی فکر میں وہ دن رات مضطرب رہتے۔ امت کی بیداری اور منزل تک اس کی رہنمائی انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔

پروفیسر محمد منور نے اس مضمون میں امت اور قوم کے فرق کی وضاحت بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کا وہ مفہوم نہیں ہے جو مغرب میں رائج ہے۔ ان کا اتحاد روحانی ہے۔(ص ۹۵) جیسا کہ علامہ اقبال نے توضیح کی ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری ۷

ہجرتِ مکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام صرف مکہ اور مدینہ کی علاقائی تقسیم کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام محض زمینی حد بندیوں کی بنیاد پر وجود میں نہیں آ سکتا۔ پروفیسر محمد منور نے اس بات کی وضاحت اقبال کے مختلف اشعار اور رسول پاکؐ کی احادیث کی روشنی میں کی ہے۔

اس زمانے میں مسلمان سیاسی لحاظ سے نہایت غیر مستحکم تھے مگر مسلمان جانتے تھے کہ ان کا یہ انحطاط وقتی ہے اور انھیں دوبارہ اس دنیا میں سر بلند ہونا ہے۔

اقبال نے بہتر مستقبل کی امید دلانے کے ساتھ اس خوش گوار مستقبل کو حاصل کرنے کی طرف راہنمائی بھی کی۔ انھوں نے خودی کا تصور پیش کیا اور رسولِ اکرمؐ کی راہ کو اپنانے کی تلقین کی کیونکہ اسی طرح سے ہر نسل، زبان اور ملک کے لوگ امت بن

سکتے تھے۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ امت کے بہتر مستقبل کے لیے جو راستہ اقبال نے دکھایا ہے افسوس ہے کہ آج مسلمان اپنے عدمِ اتفاق کی وجہ سے اس پر عمل پیرا نہیں اور اسی وجہ سے گونا گوں مسائل کا شکار ہیں۔

Iqbal on Man's Respect for Man [اقبال اور احترامِ آدم]

پروفیسر محمد منور بتاتے ہیں کہ ازمنۂ قدیم میں انسانی معاشرے ایسے انسانوں پر مشتمل تھے جنھیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہوگی کیونکہ یہ انسان ایک دوسرے کی عزت و توقیر کرنے کے فن سے یکسر نا آشنا تھے۔ اس وقت انسان صرف ایسے آدمی کا نام تھا جو اپنی غرض کو پورا کرے اور دوسرے انسان کی پروا نہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں سے اس طرح خوف کھانے لگا جس طرح وہ خونخوار جانوروں سے ڈرتا تھا۔[۱۰۱] اس کی وجہ کیا ہے؟ انسان اپنے مقصدِ تخلیق کو بھول جاتا ہے' لہٰذا اس کی کج روی جب بھی عیاں ہوتی ہے تو وہ اپنے مقام و مرتبے سے گری ہوئی حرکات کرنے لگتا ہے۔ ضروری ہے کہ انسان زندگی کے مقصد سے آشنا ہو۔ اقبال کے الفاظ میں:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم۸

اصل بات یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے مقصدِ تخلیق سے ناواقف رہے گا اس وقت تک وہ کوئی قابلِ قدر' عمدہ کام سر انجام نہیں دے سکتا۔ مغربی تہذیب اسی وجہ سے بے ثمر ہے کہ خدا کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں' اقبال نے بار بار تہذیبِ مغرب سے پناہ مانگی ہے اور اس کے تلخ ثمرات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مغرب آج تک ان نتائج کو بھگت رہا ہے۔

پروفیسر منور صاحب کہتے ہیں کہ اقبال نے تہذیب مغرب سے بچنے کے لیے جو صدا بلند کی ہے، وہ حقیقت میں انسانیت کے بچاؤ کا پیغام ہے۔ ہم نے مغربی نقالی میں جدید طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ اس طرح علم و تحقیق کے فارمولے تو ہمارے پاس موجود ہیں، مگر انسانیت کے ساتھ ہمدردی، تعلق اور شفقت کے پیمانے نہیں ہیں اور انسانیت کی تلاش اور بچاؤ کے نسخے بہر حال مسلمانوں ہی کے پاس ہیں۔ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ذریعے ہی انسانیت سے محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ (ص ۱۲۷، ۱۲۸)

Iqbal on Finality of Prophethood اقبال اور ختم نبوت

خدا کا وجود کائنات میں مسلّم ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط لاثانی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی ہدایت لازم ہے، اور اس کے لیے کوئی انسان ہی راہنما ہو سکتا ہے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال بھی اسی کے قائل ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہر دور میں بنی نوعِ انسان کی ضرورت رہا ہے۔ حضور اکرمؐ کی صورت میں نبوت کی تکمیل ہوئی ہے اور اس تکمیل کا مطلب ہے پیغام کا کامل ہو جانا۔ (ص ۱۳۰) اقبال نے اس بات کو یوں بیان کیا:

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت
تا چراغ یک محمدؐ برفروخت۹

پروفیسر محمد منور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دو محمد یعنی دو پیغمبر ہونا ممکن نہیں ہے۔ (ص ۱۳۱) اگر خدا ایک ہے، اس کا قانون ایک ہے، تو مختلف اقوام کے لیے اخلاقی رویے مختلف نہیں ہو سکتے۔

پروفیسر محمد منور یہاں اقوامِ متحدہ کی مثال دیتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سبھی قاتل قومیں اکٹھی ہو کر سازش کرنے لگیں کہ کس طرح دنیا کی تقسیم کے منصوبے کو

یقینی بنائیں اور انسانیت کو نقصان پہنچائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانیت کو جس انصاف کی ضرورت ہے اس کے لیے مل بیٹھنے کی جگہ صرف ملّے میں کعبہ ہے۔

تعلیم یافتہ افراد موجود ہیں لیکن انھیں انسانیت کے مسائل سے ہمدردی نہیں ہے۔ صرف ذاتی مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دوستی کے نام پر دھوکا ہے' امداد کی تقسیم میں سراسر تعصب ہے۔ اقبال بھی جب مغرب کی اس نمائشی ترقی اور تہذیب کو دیکھتے ہیں تو اس کے نقائص واضح کر دیتے ہیں۔

رسولِ اکرم ا کی زندگی کا ایک نہایت اہم اصول امانت و دیانت ہے۔ یہ اپنے اندر نہایت وسیع مفہوم رکھتا ہے' جبکہ ہم اس کو تنگ نظری سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہماری تمام ذہنی' جسمانی' مادی اور روحانی صلاحیتیں خدا کی امانت ہیں اور ہمیں خدا کے احکامات کے مطابق ان کی پاسبانی کرنی چاہیے۔ پروفیسر محمد منور نے امانت کے وسیع معنی کو قرآنی آیات اور احادیث کی مدد

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات ا ا

پروفیسر محمد منور' اقبال کے افکار اور قرآن کی تعلیمات سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کا اعلان' تعلیم کا حصول' اور اس علم کو دل میں جگہ دینا' یہ سب مختلف النوع چیزیں ہیں۔ جب تک کوئی نظریہ دل میں جاگزیں ہو کر عمل میں نہیں آتا' اس وقت تک جملہ اخلاقی و روحانی تعلیمات بے معنی ہیں۔

❑ Hafeez Pays Tribute to Iqbal اقبال کو حفیظ کا خراجِ تحسین

زیرِ نظر مضمون' پروفیسر محمد منور کے اردو مجموعے میزانِ اقبال میں شامل مضمون' ابو الاثر بحضورِ اقبال' کا انگریزی ترجمہ ہے اور جیسا کہ مرزا صاحب نے دیباچے میں بتایا ہے کہ اس مضمون کو جناب پروفیسر آر اے خاں نے کتاب ہذا کے لیے ترجمہ کیا ہے

۔(یہاں اس مضمون کے مطالب کو مکرر بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔)

☆☆☆

مطالعۂ اقبال کے مختلف پہلو Dimensions of Iqbal

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۸ مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون بعنوانِ Iqbal on Man's Metaphorical Death ایقانِ اقبال میں شامل اردو مضمون کا ترجمہ ہے۔ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے' جس میں آپ نے پروفیسر محمد منور کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرزا محمد منور کے لیے اقبال اور اقبالیات محض ایک موضوع یا پیشہ ورانہ دلچسپی کی بات نہیں' بلکہ ایک جذبہ یا ایک تحریک یہ ان کا عشق ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

Iqbal for Mirza Munawwar is a passion and not a profession. (P:i)

آپ کی یہ کتاب قومی صدارتی ایوارڈ یافتہ ہے۔ ذیل میں کتاب کے مضامین کا تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے:

❑ Iqbal's Contribution towards Literature and Politics ادب و سیاست میں اقبال کا کارنامہ

مضمون کے آغاز میں علامہ مرحوم کی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کا مختصر ذکر ہے۔ پھر عربی زبان و ادب سے علامہ کی دلچسپی' فارسی زبان میں ان کی مہارت' انگریزی زبان پر عبور' بعد ازاں کلامِ اقبال کے پس منظر اور اس کے مختلف ادوار کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

اقبال کے حالاتِ زندگی میں مسلم لیگ میں ان کی شمولیت اور لندن میں گول میز

کانفرنسوں میں ان کی شرکت‘ جیسے اہم واقعات کا بھی پروفیسر محمد منور نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔ مغربی تہذیب پر تنقید‘ فکرِ اقبال کا ایک اہم پہلو ہے‘ پروفیسر محمد منور صاحب نے چند پیراگرافوں میں مغرب پر اقبال کی تنقید کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور یہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کی شاعری میں یہ رجحان اردو شاعری کے لیے اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔

اس کے بعد پروفیسر محمد منور‘ مخالفین کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد کے بعد، علامہ اقبال خاموش ہو گئے تھے۔ آپ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کو یقین تھا کہ مسلمان اس منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اقبال کو یہ معلوم تھا کہ اس خواب کے پورا ہونے میں وقت لگے گا۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ کوئی جان دار شخصیت مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں قائداعظم محمد علی جناح کی صورت میں‘ اقبال کو ایسا راہبر مل گیا‘ جو مسلمانانِ برعظیم کو آزادی کی منزل تک پہنچا سکتا تھا۔ (ص ۱۷)

اقبال نے اپنی زندگی میں شاعری اور سیاست میں جو نمایاں کارنامے انجام دیے‘ یہ مضمون ان پر ایک تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے کتاب کے دیباچے میں اس مضمون کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔

❑ Iqbal on Man`s Self Evasion اقبال اور انسان کی نفیِ ذات

اس مضمون میں پروفیسر محمد منور نے اقبال کا یہ تصور اجاگر کیا ہے کہ انسان کائنات میں اپنے مقام و مرتبے سے آگاہ نہیں ہے اور جو لوگ کائنات میں اپنا مقام پہچان کر اس کے مطابق اپنا کردار ادا کریں‘ وہ شاید نا پید ہیں۔

پروفیسر محمد منور صاحب کے نزدیک اقبال کی ساری شاعری کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے جسم‘ روح‘ ذہن اور فکر کے سبب پوری کائنات میں سب سے افضل ہے اور اس

کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو پہچانے اور ایسا تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ خدا کو پہچان لے۔ اس کے لیے سجدہ ایک احسن صورت ہے۔ سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ جو جس قدر مٹی کے زیادہ قریب رہتا ہے، وہ اپنی ذات پر غور کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بڑی صلاحیت رکھی ہے، اسے چاہیے کہ اس کو استعمال کرے اور سامنے لائے۔ کیونکہ بقول پروفیسر محمد منور اس کو یہ کردار ادا کرنا ہے۔ وہ اپنی تقدیر کا آپ مالک ہے۔ (ص ۲۳) لیکن انسان کی یہی خرابی ہے کہ وہ دوسرے تمام متفرق کام کرتا ہے لیکن ذات کی تسخیر کے اصل کام کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ مرزا صاحب نے خودی کی تربیت کے تین مراحل کا ذکر بھی اس مضمون میں کیا ہے۔ یعنی اطاعت ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔

آخر میں پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اپنی ذات کی پہچان کے لیے خالق کی پہچان اور اس کے نبیؐ کا مکمل اتباع نہایت لازمی ہے۔

❑ Iqbal`s Idea of Democracy اقبال کا تصورِ جمہوریت

مذکورہ مضمون میں پروفیسر محمد منور صاحب نے Fountain Dictionary of Modern Thought کے حوالے سے لکھا ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت، مکمل طور پر مثبت اور تعمیری سرگرمیوں کا نام نہیں ہے۔ اقبال بھی جمہوریت کے منفی پہلوؤں کی وجہ سے نالاں تھے اور مغربی جمہوری طرزِ حکومت پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ مغرب میں مادر پدر آزادی کے تصور کی وجہ سے فضول اور لغو کام بھی جمہور کی اجازت سے کرنا ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔ پروفیسر محمد منور صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کسی بھی نظریے کو محض اس لیے تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ نظریات معاشرے میں رائج ہیں، بلکہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے

حوالے سے پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت' آمریت' جمہوریت اور مطلق العنان حکومت سے بالکل الگ ہے۔

عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اقبال کے نزدیک جمہوریت اسلام سے قریب تر ہے؟ اس سوال کے جواب میں پروفیسر صاحب نے اقبال کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں اقبال نے کہا ہے کہ مسلم قوم ایک روحانی برادری کا نام ہے اور برطانیہ میں جاری جمہوریت اسلام سے قریب ہے' مگر اقبال کی یہ تحریر اس وقت کی ہے جب آپ صرف ۳۱ برس کے تھے۔ بعد میں اقبال کی شاعری میں تصورِ جمہوریت کے خدوخال بڑے نمایاں نظر آتے ہیں' جنھیں پروفیسر محمد منور نے اپنے شعروں کی مدد سے واضح کیا ہے۔

آخر میں پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال ایسی جمہوریت کے قائل تھے' جو شریعت کے نظامِ شوریٰ کے قریب تر ہو۔

❑ Iqbal on Man`s Metaphorical Death اقبال اور مرگِ مجازی

پروفیسر محمد منور کی کتاب ایقانِ اقبال میں ایک مضمون' علامہ اقبال اور مرگِ مجازی' شامل ہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی کا انگریزی ترجمہ ہے۔ (اس لیے اس کے مطالب کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔)

❑ Iqbal Epoch Making Poet-Philosopher اقبال معمارِ جہاں فلسفی شاعر

اس مضمون میں پروفیسر محمد منور' ولیم جیمز کے حوالے سے کہتے ہیں کہ افراد ہی معاشرے کو بلندی تک لے جاتے ہیں۔ ایک تحریک ایک شخص کی بدولت دس سال کا سفر ایک سال میں طے کر لیتی ہے۔ ہیگل کی رائے کے مطابق مفید اشخاص و افراد

روحِ عصر ہوتے ہیں ۔اس کے بعد آپ نے اس سلسلے میں قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے کہ خاکی وجود بہت بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ پروفیسر محمد منور نے اس سلسلے میں سر سید' حالی' اکبر' ظفر علی خاں' علی برادران' قائد اعظم اور اقبال کی مثالیں دی ہیں کہ یہ لوگ محنتِ شاقہ کی بدولت نامور ہوئے ۔ان میں بھی اقبال اس لیے نمایاں ہیں کہ وہ مفکر اور دانائے راز ہیں اور تاریخ ساز شاعر ہیں ۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں اقبال کے علاوہ دنیا میں کوئی اور ایسا فلسفی شاعر نہیں ہے کہ جس نے اپنی فکر کو اس قدر جامع انداز میں پیش کیا ہو اور اس کے اثرات پوری قوم پر مرتب ہوئے ہوں ۔

مشکلات اور راستے کی رکاوٹیں ان افراد کی صلاحیتوں کو چمکا دیتی ہیں' جو بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں ۔ اس اصولی حقیقت کے لیے مرزا محمد منور نے کارائل کی تحریروں کا حوالہ بھی دیا ہے ۔آپ نے اقبال کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالی ہے کہ اقبال نے ہر دور میں نظریات کے چیلنج قبول کر کے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال انسانِ اعلیٰ یا فوق البشر (Superman) تو نہیں تھے لیکن ان کے اندر اعلیٰ درجے کی انسانی خصوصیات موجود تھیں ۔ اقبال نے اپنے افکارِ تازہ کے ذریعے مردہ قوم کی رگوں میں نیا خون داخل کیا، اس لحاظ سے انھیں تاریخ کا دھارا تبدیل کرنے والا شاعر کہہ سکتے ہیں ۔

❑ Iqbal and the World of Quran. [اقبال اور جہانِ قرآن]:

جہانِ قرآن کیا ہے؟ یہی اس مضمون کا موضوع ہے ۔ اقبال کے نزدیک قرآن کا پیغام تمام انسانیت کے لیے ہے' انسانیت کا جوہر ایک ہے' مگر علاقائی قوم پرستی نے یورپ میں تو انسانیت کے جوہر کو کچل کے رکھ دیا ہے ۔ کیونکہ ان کے پاس قرآن جیسی عظیم کتاب موجود نہیں ہے ۔قرآن کے اولین مخاطب اہل مکہ تھے' لیکن

اس کے مخاطب ہر دور میں آنے والے انسان ہیں۔

پروفیسر محمد منور نے اپنی بات کی دلیل میں منٹگمری واٹ کا حوالہ دیا ہے کہ یہ مذہب ہی اس صلاحیت کا حامل ہے کہ تمام انسانوں کو یکجا کر سکے۔ اگر کوئی انسان' ذات' خاندان اور پیدائش کی بنا پر فخر و برتری کا اظہار کرتا ہے تو وہ قرآن کے پیغام سے بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ جہان قرآن میں ہر چیز کو ماپنے کے پیمانے مختلف ہیں۔ قرآن اعمال صالحہ کو اہمیت دیتا ہے۔ انھوں نے بریٹرنڈ رسل کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ اقدار کا دائرہ سائنس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ہر موقع پر قرآن کی تعلیمات کو اپنی شاعری میں سمو کر بیان کیا ہے۔ قرآن نے جو امید کا پیغام دیا ہے وہ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے ذریعے سے واضح ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد منور نے اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اقبال کو اس بات کا دکھ تھا کہ مسلمان یورپ کی بالادستی سے متاثر ہیں' لہٰذا تباہ حال ہیں۔ حالانکہ قرآن ان کے سامنے روشنی اور ترقی کے تمام راستے روشن کرتا ہے۔

❑ Iqbal and the words of the Quran [اقبال اور قرآن کے الفاظ]:

اس مضمون میں مرزا محمد منور سورہ العلق کی پہلی آیت سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا ہے اور کہا ہے کہ پیغام کی بنیاد ''لفظ'' ہیں اور قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

قرآن اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوا، یا یہ ایک پیغام تھا اور اس نے الفاظ کی شکل اختیار کی۔ اس مسئلے پر پروفیسر محمد منور اقبال کی اس رائے سے متفق ہیں کہ قرآن ان

ہی الفاظ میں نازل ہوا جن میں یہ عرش پر موجود ہے۔علامہ اقبال اس پر مطمئن ہیں کہ قرآنی الفاظ حقیقت ہیں۔پروفیسر محمد منور نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے جس کے مطابق اقبال نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ جب مجھ پر شعر نازل ہو سکتے ہیں تو آنحضرتؐ پر وحی کیوں نہیں آ سکتی؟ تو میں شک کیوں کروں ۔ یہاں وہ پروفیسر ایف کے ہٹی کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا کہ قرآن نازل ہوا ہے جبکہ انجیل کو مدوّن (edit) کیا گیا ہے۔آپ نے بہت سے حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے خیال میں قرآن ظاہری لحاظ سے بھی شفا اور رحمت ہے ۔ یہ قرآن کے الفاظ ہی تھے جنھوں نے حضرت عمرؓ کی دنیا بدل دی۔ایک کم پڑھے لکھے شخص نے بھی ان الفاظ میں پوشیدہ حقیقت کو پہچان لیا تھا۔اس میں الفاظ کی تاثیر کا ایک بڑا حصہ تھا۔مضمون میں آپ نے جابجا آیاتِ قرآنی کے حوالے دیے ہیں۔

❑ Iqbal and Test of Faith [اقبال اور ایمان کی آزمائش]

اس مضمون میں مرزا محمد منور علامہ اقبال کے اس نظریے کی توضیح کرتے ہیں کہ انسان کا فن آسائشوں سے نہیں آزمائشوں سے نکھرتا ہے اور ابتلا کے بغیر انسان اپنے آپ کو بھی تلاش نہیں کرسکتا۔شیطان کے بغیر آدم کی داستان ہمیشہ نامکمل رہتی ہے بلکہ اقبال تو یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ شیطان ایک لحاظ سے نعمت ہے کہ وہ انسان کو اپنے ایمان کے جائزے اور پختگی کا موقع فراہم کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے قرآن مجید کی متعدد آیات کا حوالہ دیا ہے، جن کے مطابق آزمائش زندگی کا لازمہ ہے اور اس آزمائش سے ایمان بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔جو بھی شخص اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو، اس کی زندگی میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں۔جس طرح صحت کے لیے ورزش کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح روحانی صحت کے لیے نماز اور اذکار ضروری ہیں۔مضمون کے آخر میں پروفیسر محمد منور کہتے

ہیں کہ کمزور عقیدے کے لوگ صرف اس وقت تک اہلِ ایمان کا ساتھ دیتے ہیں جب تک ان کا کوئی مفاد وابستہ رہے۔ یہ کوئی مثبت رجحان نہیں ہے۔ ایمان کی پختگی ہونی چاہیے اور مفادات سے اجتناب لازم ہے۔

☆☆☆

Iqbal on Human Perfection

[اقبال اور انسانی تکمیل]

۱۹اصفحات پر مشتمل یہ کتاب پروفیسر محمد منور کی وفات کے بعد ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ کتاب ۱۰ مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو مضامین براہِ راست اقبال کے حوالے سے نہیں ہیں، تاہم ان مضامین میں دیگر مفکرین کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کا موقف بھی پیش کیا گیا ہے۔ بقیہ ۸ مضامین میں اقبال کے مختلف افکار کی توضیح کی گئی ہے۔

کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے تحریر کیا ہے۔ پروفیسر محمد منور کی کتاب علامہ اقبال کی فارسی غزل کا دیباچہ بھی انھی کے قلم سے ہے۔ اس دیباچے میں آپ لکھتے ہیں کہ مرزا منور ایک غیر معمولی محقق، ایک سحر البیان خطیب اور ایک مخلص استاد کے طور پر بھی نمایاں رہے۔ آپ کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات علمی گہرائی، فکری پختگی اور اسلام اور پاکستان سے وابستگی ہے۔ وہ خود ایک مشاق شاعر اس شاعرانہ فن اور اس کی باریکیوں سے خوب آگاہ ہیں۔ بالخصوص جب وہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں جس کے اندر گہرے نظریات اور خیالات کی پرواز ہے۔ اس کے بعد وہ اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ کتاب میں دس مضامین ہیں جو گذشتہ دس برسوں میں لکھے گئے ہیں، یہ پروفیسر محمد منور کی تخلیقی صلاحیت کا خوبصورت اظہار ہیں۔ غالب موضوع یہ ہے کہ اقبال نے کس طرح قرآن سے راہنمائی

حاصل کی اور کس طرح انسان کی فطرت کو سمجھا اور اس کے مقام کو دریافت کیا اور مسلم امت کا مستقبل تلاش کیا۔ان تمام مضامین میں ایک ہی خیال بار بار گردش کر رہا ہے اور وہ ہے روحانی ارتقا۔علامہ اقبال کا ایک شعر پروفیسر محمد منور نے بار بار اپنے مضامین میں استعمال کیا ہے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا ۱۲

ڈاکٹر شبلی کہتے ہیں کہ اس کتاب کے موضوعات اور مواد کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد منور بڑی بے چینی اور اضطراب سے اقبال کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں۔اس کے لیے خودی کو بیدار کرنا ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے۔اکثر مضامین خودی ہی کے متعلق ہیں۔

ذیل میں کتاب کے مضامین کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

❑ Quran and Man`s Spiritual Evalution [قرآن اور انسان کا روحانی ارتقا]

۵۳ صفحات پر مشتمل یہ طویل مضمون عالمانہ نوعیت کا ہے۔پروفیسر محمد منور نے مغربی فلسفیوں اور مفکرین کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔اقبال کے انگریزی خطبات کا بھی ذکر آیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ اللہ کی ودیعت کردہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اس لیے ہیں کہ انسان اپنی شخصیت کو قانونِ قدرت کے مطابق پروان چڑھائے۔فطرت کے مطلوبہ اوصاف اسے خدا ہی سے معلوم کرنے ہوں گے کیونکہ خدا ہی نے اسے تخلیق کیا ہے۔پروفیسر محمد منور نے مختلف قرآنی آیات سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح ہر فرد پر لازم ہے۔قرآن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کائنات توازن

کے اصول پر اس لیے چل رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو مان رہی ہے۔ اگر انسان بھی ایسا کرے تو اس کی زندگی بہترین صورت اختیار کرے گی' مگر خدائی احکامات کو ماننے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ علم' فکری بصیرت عطا کرتا ہے جس سے انسان کے روحانی ارتقا میں مدد ملتی ہے۔

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اسلام جو علم دیتا ہے' ایمان اور عقیدہ آخرت کے ذریعے اس میں بہت وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور موجودہ دور میں انسان کو اخلاقی اقدار کی ضرورت ہے۔ یہ اخلاق ہی انسان کو بلند مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے اور انسان ارتقا کی جانب قدم اٹھاتا ہے۔ (ص ۵۷)

آخر میں وہ کہتے ہیں کہ جن معاشروں کی بنیاد انسان دوستی پر استوار نہیں کی جاتی' وہ معاشرے خیر و شر کی تمیز نہیں کر سکتے۔ انسان کو اسی لیے خلیفۃ اللہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ تسخیر کائنات کو جاری رکھ سکے۔ انسان کو کائنات میں اقتدار اس لیے ملا ہے کہ وہ اس کی مرضی کو زمین پر نافذ کر دے۔

پروفیسر محمد منور صاحب کہتے ہیں کہ سچا مذہب یہی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اسے کسی نے پیدا کیا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ یہی فطرت ہر انسان کے اندر ہے۔ وہ کہتے ہیں توحید پر عمل درآمد کا مکمل نمونہ تو صرف رسول اللہ کے قائم کردہ نظام میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ (ص ۸۳) توحید کے سبب کائنات میں توازن ہے اور توحید ہی کے ذریعے سے بنی نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو سکتا ہے۔ عقیدۂ توحید ایک جامع عقیدہ ہے جو اس عقیدے کو اپنا لے' اس کا ہر عمل' ہر سانس عبادت بن جاتا ہے۔

❑ Iqbal on Realization of Personality [اقبال اور شخصیت کا ادراک]

پروفیسر محمد منور کے خیال میں علامہ اقبال نے فارسی لفظ 'خودی' کو نئی شناخت' نیا آہنگ' نئی وسعت اور نیا مفہوم دیا ہے۔اس سے قبل عام طور پر خودی کو منفی معنوں میں لیا جاتا تھا۔اقبال نے اس کا ایک مثبت تصور دیا۔

پروفیسر محمد منور نے وضاحت کی ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہ خود بھی اس کے ادراک سے قاصر ہے۔اقبال کے نزدیک خودی کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ اپنے آپ کو شخصی اور اخلاقی طور پر بلند کرے۔وہ جس راستے سے بھی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے گا' اس کی منزل اس کے لیے آسان ہوتی چلی جائے گی۔اللہ تعالیٰ نے خود آدم میں اپنی روح پھونک دی ہے۔انسان اپنے وجود اور مقام کا ادراک کرے تو وہی کائنات کا حکمران ہے۔اس طرح وہ کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے۔مگر اس کائنات کو تسخیر کرنے کے لیے اسے اپنی خودی کی تربیت کرنا ہوگی۔علامہ اقبال نے اس کے تین مراحل بتائے ہیں' جن کا ذکر پروفیسر محمد منور نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔۱۔اطاعتِ الٰہی ۲۔ضبطِ نفس ۳۔نیابتِ الٰہی۔

یہ مضمون ڈیفنس کالج' کوئٹہ میں پڑھا گیا تھا۔مجلّہ الدعوہ (جون ۱۹۹۱ء) میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

❑ Iqbal on Ummah versus Nationalism [اقبال کے ہاں امت اور تصورِ قوم پرستی]

علامہ اقبال قوم پرستی کے اس محدود تصور کے خلاف تھے' جسے ان کے زمانے میں مغربی تہذیب اور ہندو فروغ دے رہے تھے۔مرزا صاحب کہتے ہیں: زبان' علاقے اور نسل کی بنیاد پر جو افراد ایک دوسرے سے مل کر قوم تشکیل دیتے ہیں وہ قوم تو بن سکتے ہیں' امت نہیں بن سکتے۔

پروفیسر محمد منور نے اقبال کے اشعار کی مدد سے اقبال کے تصورِ قومیت کی وضاحت کی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ رسول عربی ؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے یہ پیغام دیا تھا کہ اللہ کے بندوں کے لیے وطن کی حد بندی اتنی اہم نہیں ہے۔ ایسی حد بندیاں اگر شدید ہوں تو خدا پرستی میں رکاوٹ آ سکتی ہے۔ سلمان فارسی ص نے اسی لیے اپنے آپ کو سلمان ابن اسلام ابن اسلام کہا کہ ان کی نظر میں رنگ، نسل، قومیت کی بنیادیں غیر حقیقی تھیں۔ اگر چہ مسلمان سیاسی طور پر الگ الگ اکائیوں میں منقسم ہیں، مگر وہ ایک کل کا حصہ ہیں۔

پروفیسر محمد منور اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ مسلمان نہ صرف ابھی تک تنہا ہیں، بلکہ ایک ایسے کارواں کی مانند ہیں، جس کا کوئی راہنما موجود نہیں۔

❑ Iqbal on Islamic Resurgence [اقبال اور اسلامی نشاتِ ثانیہ]

علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء کی غزل (سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر) میں مغرب کی تہذیب کے زوال کی پیش گوئی کی تھی۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے لندن میں ۱۹۳۱ء میں کیمبرج میں ایک مجلس میں اعلان کیا کہ پچیس برس قبل میں نے (مغربی تہذیب کے زوال پذیر ہونے کی) جو پیش گوئی کی تھی، وہ جنگِ عظیم اول کی صورت میں پوری ہو چکی ہے۔ اقبال کو پختہ یقین تھا کہ اسلامی نشاتِ ثانیہ کا سورج جلد ہی برعظیم سے طلوع ہو گا۔ اقبال نے ۱۹۲۷ء کی ایک فارسی غزل (زبورِ عجم) میں بتایا تھا کہ ایک ایسے راہنما کے ظہور کا وقت آ پہنچا ہے، جو کاروان کو منزل تک پہنچا دے گا اور آخری شعر میں انھوں نے یہ دردناک اطلاع بھی دی کہ میں اس انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا۔

مرزا صاحب نے ۱۹۲۳ء میں برعظیم کی خلافت تحریک، ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے

سالانہ اجلاس اور ۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ سب واقعات اقبال کی پیش گوئی کی طرف راہنمائی کر رہے تھے۔ خطبہ الہ آباد اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس ۱۹۳۲ء میں اقبال کے خطبے کے حوالے سے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کے ذہن میں واضح تھا کہ مسلمان اور ہندو مزید اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے ایک بار خود قائداعظم سے درخواست کی تھی کہ وہ قوم کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ محمد علی جناح کی صورت میں وہ راہبر آ چکا ہے‘ جو قوم کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلا دے گا۔ آخر میں پروفیسر محمد منور یہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ اقبال کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ جو لوگ اس منزل (پاکستان) کو حاصل کریں گے‘ وہ سارے ایشیا کے مسلمانوں کے حقوق کے نگہبان ہوں گے یعنی پاکستان کی وادی سے احیائے اسلام کا کارواں روانہ ہوگا۔ پروفیسر محمد منور سمجھتے ہیں کہ اقبال کی اس پیش گوئی کے حوالے سے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ (ص ۱۲۵)

❑ Iqbal's Spiritual Democracy [اقبال کی روحانی جمہوریت]

لفظِ جمہوریت کی متعدد وضاحتیں کی جاتی ہیں۔ پروفیسر محمد منور نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ اکثریت کی حکومت کے معنی واضح ہیں۔ اگر بات صرف اکثریت کی ہو تو بہت سی چیزوں کے مفہوم بدل جاتے ہیں لیکن اکثریت اچھی باتوں کے ساتھ بری چیز کے حق میں بھی فیصلہ دے سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک مغربی جمہوریت غاصبانہ‘ ظالمانہ‘ جارحانہ‘ اور مغرب کے سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک کند ہتھیار ہے۔ وہ جمہوریت کے ذریعے سیاست کے میدان میں اس لیے آتے ہیں کہ اپنی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ مرزا محمد منور کے خیال میں جو چیز ظاہر

میں جمہوریت ہے، حقیقت میں وہ استعمار ہے۔

مرزا صاحب وضاحت کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے ہاں روحانی جمہوریت اسلام کا اصل مقصود ہے (ص ۱۳۸) یعنی ایسی جمہوریت جس میں اللہ اور رسول کے احکامات نافذ کیے جائیں کیونکہ خدا کا قانون ہی انسان کی فطرت کے قریب ترین ہے۔(ص ۱۴۲) جمہوریت کے اندر اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں، لیکن روحانی جمہوریت میں خدا، رسول اور شریعت کے قوانین کو بالاتر مانا جاتا ہے۔خواہ اکثریت پسند کرے یا نہ کرے۔

پروفیسر محمد منور نے مغربی جمہوریت پر سخت تنقید کی ہے اور اقبال کے تتبع میں اس کے نقصانات اور منفی پہلو بتائے ہیں۔خلاصۂ کلام یہ کہ مغربی جمہوریت صرف اس صورت میں قابلِ عمل اور پسندیدہ ہے جب اس میں انسانوں کے خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی قابلِ لحاظ حیثیت دی جائے۔

Iqbal: A Motivator of Purposeful Lifeq [اقبال: بامقصد زندگی کا ترجمان]

اچھی شاعری معاشرے میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہے اور معاشرے میں اعلیٰ اور مثبت اقدار کو فروغ دیتی ہے، لیکن شہرت پسند شاعر کبھی اعلیٰ خیالات اور ہمیشہ باقی رہنے والی شاعری نہیں کرسکتا۔اس تمہید کے بعد پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے شاعری میں اعلیٰ مقام بتدریج حاصل کیا۔انھوں نے ایک عام وکیل کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔چاہتے تو وکالت میں نام اور دولت بھی کما سکتے تھے، لیکن انھوں نے مذہب سے محبت کے سبب اپنے فن اور شاعری اور افکار کی ترویج کو ترجیح دی اور سیاست میں بھی نمایاں رہے۔وہ جامد زندگی کے قائل نہ تھے۔ہمیشہ متحرک رہے اور دینی فکر سے پوری قوم کو جگانے کا کام بھی کیا:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا۱۳

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کا مردِ مومن 'متحرک' بامقصد اور پر جوش ہے۔ان کے نزدیک زندگی میں حرکت وعمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں جدو جہد ہو اور جدو جہد اس وقت کی جاسکتی ہے' جب ایمان پختہ ہو۔علامہ اپنی شاعری میں جابجا یہ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی اعلیٰ مقصد سامنے نہ ہو' زندگی اور صبح و شام بے مصرف ہیں ۔ارمغانِ حجاز میں کہتے ہیں:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں۱۴

پروفیسر محمد منور لکھتے ہیں کہ اقبال کے قلم کی مثال ایسی فوج کی ہے' جو فتوحات پر فتوحات کرتی چلی گئی ہو۔(ص ۱۵۵)

❑ Iqbal Denied He was a Poet [مجھ کو شاعر نہ کہو: اقبال]

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال کا ذوقِ شعری اوائلِ عمر ہی سے نمایاں اور منفرد رہا ہے۔انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اپنی شعری صلاحیت کو غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے استعمال کریں گے۔

پروفیسر منور کہتے ہیں کہ بامقصد اور صحت مند شاعری فرد اور معاشرے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اقبال کے زمانے میں مقصدی شاعری کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا' سوائے اکبرالہ آبادی' ظفر علی خاں اور الطاف حسین حالی کے باقی تمام شعرا' شاعری برائے شاعری کر رہے تھے۔اسی وجہ سے اقبال کو کہنا پڑا کہ میں شاعر نہیں ہوں ۔(ص ۱۷۱)

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ اقبال نے انسانی زندگی اور انسان کا مطالعہ بہت گہرائی

سے کیا تھا اور انھوں نے روح کے عمیق سمندر کی شناوری کی تھی اور جب وہ واپس پلٹے تو ان کے ہاتھ میں موتی تھے جو انھوں نے دور اور قریب کے لوگوں میں بکھیر دیے۔(ص ۱۷۷)وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اقبال سے پہلے کتنے شاعر تھے جنھوں نے معاشرے میں تبدیلی کے بارے میں سوچا؟ کون سا شاعر ایسا تھا جس نے سوچا ہو کہ میں اپنی صلاحیتوں کو اصلاحِ قوم اور تبدیلی کے لیے استعمال کروں گا؟ پروفیسر منور کہتے ہیں کہ یہ صرف اقبال تھے۔چونکہ روایتی' پیشہ ور' اور الجھے ہوئے شاعر معاشرے میں نا امیدی اور مایوسی پھیلا رہے تھے، اس لیے اقبال اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ انھیں بھی شاعروں کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ارمغانِ حجاز میں رسالت مآب ا سے یہی فریاد کرتے ہیں:

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند ۱۵

Iqbal on Man's Search of Self [اقبال اور انسان کی تلاشِ

ذات]

کائنات کی تخلیق انسان کے لیے کی گئی ہے' اس کو لامحدود ذہنی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اگر ان تمام باتوں کے باوجود انسان اپنی ذات سے آگاہی حاصل نہ کر سکے' تو یہ اس کی بدنصیبی ہو گی:

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی ۱۶

پروفیسر محمد منور کہتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت بالعموم جامع شخصیت کی حامل نہیں ہوتی۔انسان کی ذات میں یک رنگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کی روح اس کی ذات پر حاوی ہو۔آپ نے ایک مغربی مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنے

آپ کو نہیں سمجھ سکتا وہ کائنات کے سربستہ راز کیسے سمجھ سکتا ہے۔

علامہ اقبال تلاشِ خودی کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان جس قدر اپنے آپ سے آگاہ ہوگا، اسی قدر اسے رب کی عبادت میں لطف آئے گا۔ کیونکہ انسان جتنا خدا کے قریب ہوتا ہے' عبادت اتنی ہی آسان ہو جاتی ہے۔ اگر انسان یہ جان لے کہ زندگی کیا ہے تو عبادت سہل بن جاتی ہے۔

قرآن بیان کرتا ہے کہ سورج' چاند' ستارے' موسم' پھل' درخت اور جاندار' ریت کے ذرّے سے لے کر بڑے بڑے ستاروں تک سب انسان کے تابع فرمان بنا دیے گئے ہیں۔ سب سے اہم اور اصولی بات یہ ہے کہ انسان کو کائنات کے لیے نہیں بلکہ کائنات کو انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ انسان کو خدا کے پیغام کی تشریح و توضیح کے لیے بھیجا گیا ہے' اس لیے اس کو بہترین ساخت دی گئی ہے۔ اس کو بہترین حسِ تنقید سے نوازا گیا ہے۔

بے شک اللہ نے انسان کو خلیفہ بنا دیا' وہ اپنی ذات کا شعور حاصل کر کے ہی یہ ذمہ داری نباہ سکتا ہے اور search of self یہی ہے۔

☆☆☆

حوالے و حواشی

۱۔ علامہ اقبال' ضربِ کلیم' ص ۵۰۔

۲۔ "بالِ جبریل' ص ۲۳۔

۳۔ "ضربِ کلیم' ص ۱۸۶۔

۴۔ "بالِ جبریل' ص ۳۸۔

۵۔ ایضاً ص ۴۵۔

۶۔ "ارمغانِ حجاز" ص ۵۹۔

۷۔ "بانگِ درا" ص ۲۴۸۔

۸۔ "اسرار و رموز" ص ۱۷۔

۹۔ "" ص ۱۳۔

۱۰۔ "بالِ جبریل" ص ۴۳۔

۱۱۔ "" ص ۱۰۷۔

۱۲۔ "بانگِ درا" ص ۱۴۲۔

۱۳۔ """"

۱۴۔ "ارمغانِ حجاز" ص ۴۲۔

۱۵۔ " " ص ۴۳۔

۱۶۔ "بالِ جبریل" ص ۱۲۲۔

☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

باب پنجم

پروفیسر محمد منور کی اقبال شناسی

(مجموعی جائزہ)

اقبال شناسی کے موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اب اس حوالے سے مزید کچھ لکھنے کی گنجائش موجود نہیں ہے' لیکن 'اقبال پرستی' کی حدود سے نکل کر جب ہم بقول مشفق خواجہ:

اقبال شناسی کی منزل کی طرف بڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بہت سا کام باقی ہے اور اقبال کی زندگی کے بہت سے گوشے تا حال ایسے ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔۱

اقبالیات کے ایک عالم قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا خیال ہے کہ گو اقبال کے پیغام فلسفے' شاعری اور ان کی علمی و ادبی اور سیاسی کوششوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان کی تحصیلات اور کمالات کے پیش نظر یہ سرمایہ ابھی زیادہ سے زیادہ اضافے کا محتاج ہے۔۲

اسی ضرورت' احساس اور اقبال سے غیر معمولی عقیدت اور محبت کے پیشِ نظر ماہرینِ اقبالیات' اقبال کے نظریات کو ہر زاویے سے پرکھنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام ایک حد تک باقاعدہ شعبۂ علم وفن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اقبال شناسی کے کام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر اب تک سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالے لکھے جا چکے ہیں ۔ ڈاکٹر محمد امین اندرابی (ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سری نگر) لکھتے ہیں:

فی الوقت اقبالیات پر جو مواد کتابوں اور مضامین کی صورت میں دستیاب ہے' وہ کم از کم کمیت کے اعتبار سے بڑی حد تک قابلِ لحاظ' متنوع اور خاصا وقیع ہے۔۳

اس متنوع اور وسیع ذخیرۂ اقبالیات میں کئی طرح کی چیزیں ہیں اور مختلف رجحانات نظر آئے ہیں' مثلاً:

۱۔ایک حصہ تو ایسا ہے جسے محض رسمی اور روایتی کارروائی قرار دیا جا سکتا ہے' چونکہ علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر تھے اور نظریۂ پاکستان کے خالق بھی تھے اس لیے کسی قلبی جذبے یا دلی وابستگی کے بغیر محض ریاستی یا حکومتی ضرورت کے تحت بھی اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ ایک طرح کی رسم اذاں کے مترادف ہے' جو رُوحِ اقبال سے خالی ہے۔۴

۲۔اقبالیات کا ایک حصہ ایسا ہے جو محض علمی (academic) یا تحقیق برائے تحقیق کے ذیل میں آتا ہے اور لکھنے والے دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں اقبال شناسی کی کمی نظر آتی ہے اور بعض اوقات لکھنے والے اقبالیات کی صراطِ مستقیم سے بھٹک بھی جاتے ہیں۔

۳۔کچھ اقبالیاتی نقاد ایسے ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص نظریات کو اقبالیات کے سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے تو عمداً ایسا کیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مخصوص نظریات کے ہاتھوں مجبور ہیں، مثلاً: اختر حسین رائے پوری' یا گورکھپور کے دو بزرگ نقاد (مجنوں اور فراق)۔

۴۔کچھ نقادوں کی نظر فلک الافلاک سے نیچے نہیں اترتی جیسے کلیم الدین احمد' جن کے خیال میں اردو شاعری کا مقام اور مرتبہ مغربی ادب کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ ظاہر ہے اقبال بے چارے ان کے معیار پر کیسے پورے اتر سکتے ہیں؟۵

۵۔کچھ اقبالی علما' نے تنقید میں اختلاف و تحسین دونوں رویے برتے ہیں' اختلاف

میں ہمدردی بھی ہے اور کچھ کمزور پہلوؤں کا ذکر بھی، مگر وہ اقبال کی مجددانہ حیثیت کے مقابلے میں ان کی کمزوریوں کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک اقبال کی عظمت ان کے انقلابی لہجے میں مضمر ہے۔٦

اس پس منظر میں جب ہم مرزا محمد منور کی اقبال شناسی کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ان میں سے کسی ذیل میں بھی نہیں آتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال ان کے لیے محض شاعر یا فلسفی نہ تھے بلکہ ایک سرچشمۂ فیض تھے۔جن سے پروفیسر محمد منور نے اپنی ذہنی و روحانی پیاس بجھائی۔

پروفیسر محمد منور صاحب کی اقبال شناسی کا انداز اور اس کی نوعیت ایک اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

اقبال کے نظریات سے متعلق جو کام ہوا ہے، وہ من حیث الکل توصیفی انداز کا ہے اور اقبال سے گہری عقیدت کا تاثر پیدا کرتا ہے اور ایسے مضامین کی بھی کمی نہیں، جن میں اقبال کی مدح وستایش میں مبالغہ آرائی کو دخل ہے۔ظاہر ہے اس نوع کی نگارشات اقبال کے قریب آنے کے بجائے ان سے دوری کا احساس پیدا کرتی ہیں۔٧

پروفیسر محمد منور کو حضرت علامہ اقبال (پروفیسر صاحب اقبال کے لیے ہمیشہ 'حضرت علامہ' کی ترکیب استعمال کرتے تھے) سے ایک خاص تعلق خاطر تھا۔بچپن سے ہی آپ کے کان اقبال کی شاعری سے مانوس تھے۔گھر میں غالب اور اقبال کے مابین ایک موازنے کی کیفیت بھی رہتی تھی۔اقبال کی بعض نظموں نے آپ کو خاص طور پر متاثر کیا۔بچپن میں ایک پالتو بٹیر کو انھوں نے اس لیے آزاد کر دیا کہ ذہن میں 'پرندے کی فریاد' کے اشعار گونجنے لگے تھے۔یہ تاثیر، کلامِ اقبال کا ایک منفرد واقعہ ہے۔آگے چل کر اس اثر وتاثیر نے مرزا صاحب کے ہاں ایک طرح کی محبت' ارادت بلکہ ایک گونہ عشق کی صورت اختیار کر لی۔خود کہتے ہیں کہ: 'یہ میرا ذوقی اور

عشق مسئلہ ہے۔'

یہی مسئلہ عملی زندگی میں بھی آپ کا فن ٹھہرا۔ گویا یہ انتخاب کا معاملہ نہ تھا' بلکہ اقبالیات سے وابستگی مرزا محمد منور کے لیے ایک وہبی چیز تھی۔ اسی نے ان سے تقریریں کروائیں اور اسی نے ان سے مقالات اور کتابیں لکھوائیں اور اسی وجہ سے آپ عمر بھر اقبالیات کے پر جوش شارح اور مبلغ رہے۔ پھر آپ پاکستان کے دو نمایاں اقبالیاتی اداروں کے سربراہ بھی رہے' یعنی پنجاب یونی ورسٹی کا شعبۂ اقبالیات اور حکومت پاکستان کی اقبال اکادمی پاکستان۔ ان حیثیتوں سے آپ نے اقبالیات کے فروغ کے لیے بہت مفید کام کیے۔ اقبال پر تحقیق بھی کروائی۔ کچھ منصوبے تیار کیے۔ اقبالیاتی شمارے شائع کیے اور اس طرح اقبالیات کو ایک تحریک بنا دیا۔ جب ہم پروفیسر محمد منور کی اقبال شناسی کا جائزہ لیتے ہیں تو متذکرہ بالا سارے پہلو سامنے رہنے چاہییں۔

مرزا محمد منور نے اقبال کے فکر و نظر اور تصورات و عقائد کو ہر پہلو سے اپنے لیے ایک مقصد اور نصب العین قرار دیا تھا۔ آپ نے اقبال کی فکر کو اپنے ذہن و شعور اور لا شعور میں بھی خوب راسخ کر لیا تھا۔ اقبال ان کے لیے محض 'ایک شخصیت' نہ تھے بلکہ قرآن کے شارح تھے جن کے افکارِ عالیہ اور انقلابی لب و لہجہ میں یہ تاثیر موجود ہے کہ وہ ایک عالم کو زیر و زبر کر سکتے ہیں۔ آپ نے اقبال کے پیغام کی توضیح و تشریح میں جسم و جان کی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ یہ آپ کی زندگی کا مشن تھا۔

علامہ اقبال کے پیغام کی تشریح و توضیح کے لیے تقریر بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مرزا صاحب نے یہ ذریعہ بھی اختیار کیا۔ آپ نے فیصل آباد کالج کی ملازمت کے دوران مجلس اقبال قائم کی۔ اس کے اجلاسوں میں دوسرے مقررین کے علاوہ خود مرزا صاحب کو بھی تقاریر کا موقع ملا کہ اس مجلسِ اقبال کے

روحِ رواں بھی آپ ہی تھے۔آپ کی تقریر عموماً بہت طویل ہوتی' اس کے باوجود بہت پرتاثیر ہوتی تھی۔

آپ نے تقاریر و خطابات کے ذریعے اقبال اور فکرِ اقبال کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔اپنی تقریر میں مرزا صاحب اقبال کے فارسی اور اردو اشعار کا کثرت سے حوالہ دیا کرتے تھے۔موضوع کے مطابق دیگر حوالوں کا بھی استعمال کرتے۔اقبال کی فکر کو اس قدر عمدہ انداز و ترتیب سے پیش کرتے کہ سننے والوں پر گراں نہ گزرتا۔عام طور پر ایک گھنٹے کی تقریر سننا بھی مشکل ہوتا ہے مگر مرزا صاحب کی لمبی لمبی تقریروں کو سامعین پورے اطمینان اور دلچسپی سے سنتے تھے۔مرزا محمد منور کی تقریر میں آخر کیا تاثیر تھی؟اس بارے میں ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے بتایا کہ آپ کا علم' اندازِ بیان کی شگفتگی اور لطافت' آپ کی تقریر کو دل کش بنا دیتی تھی۔آپ نے کبھی اس لیے تقریر نہیں کی کہ لوگوں پر رعب ڈالا جائے یا ان پر اپنی علمیت کا سارا بوجھ ڈال دیا جائے۔اس کے باوجود لوگ آپ کی تقریر سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔۸

آپ تقریر کے لیے موضوع کا انتخاب حالات اور ماحول کو دیکھ کر کیا کرتے تھے اور پھر تقریر کے دوران حالاتِ حاضرہ کے حوالے بھی لے آتے تھے۔ٹورانٹو (کینیڈا) میں جب آپ نے ایک ادبی نشست میں گفتگو شروع کی تو وہاں کے مقامی رپورٹر کے مطابق حلقۂ ادب کے شرکا اور سامعین دم بخود انھیں سنتے رہے۔آپ نے اس تقریب میں اڑھائی گھنٹے تک بڑے بے تکلفانہ ماحول میں خطاب کیا۔حتیٰ کہ جب چائے کے لیے وقفے کا اعلان ہوا تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سامعین کو چائے سے زیادہ 'چاہِ سماعت' کی طلب تھی۔(اس تقریب میں آپ کا موضوع تحریکِ پاکستان تھا)۹

آپ اوائلِ عمر ہی سے اقبال کے حوالے سے تقاریر کرنے لگے تھے۔یہ گویا آپ کا